

دینارِ سَواد  
چھایت ل  
سے عقائد و  
تاریخ کی صلاح

عالمِ نبی کا عکس صاحبِ دہِ محمد  
عالمِ جنابِ حکیم سید کی حیدر زیدی

نامیہ شریں - لکھنؤ ۳ (ہندستان)



سلسلہ اشاعت امامیہ مشن لکھنؤ ۶۵۱

احکام شریعت  
مختصر  
غنائی کی اصلاح  
مباح و منکر  
از

عالم جناب حکیم سید علی حیدر صاحب نیدی دم مجرہ

سکندر پور ضلع فنیس آباد

مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ

قیمت ۵۰ روپے



# تعارف

اب سے دو سال قبل ہم جناب حکیم صاحب قبلہ رحمہ اللہ کا ایک رسالہ ثانی زہرا جناب زینب سلام اللہ علیہا کے حالات میں "پاسبان شریعت" کے نام سے شائع کر چکے ہیں جو بہت مقبول ہوا۔ اس سال ہم موصوفت کا ایک دوسرا مقالہ "احادیث رسولؐ سے تاریخ و عقاید کی اصلاح" بصورت رسالہ پیش کر رہے ہیں۔

یقین ہے کہ مومنین اس سال کی بھی کثیر سے کثیر تعداد برادرانِ وطن میں تقسیم کر کے عن اللہ و عند الرسولؐ مایہ جوں ہوں گے۔

المدعی الی الخیر

www.kitablib.com

سید ابن حسین نقوی عفی عنہ

نظم الحرام ۱۳۹۳ھ

آزیری سکریٹری امانہ مشن - لکھنؤ

فروری ۱۹۷۶ء



# انتساب

اس کتاب کا انتساب اپنے مرحوم والدین سید  
 زین العباد صاحب طاب ثراہ اور آمنہ الکبریٰ بی بی کے  
 نام کرتا ہوں جن کی دعاؤں اور نیک خواہشات  
 کی بدولت میں قابل ہو سکا کہ یہ چند سطریں بارگاہِ  
 رسولؐ و اہلبیتؑ میں بطور زندانہ عقیدت  
 پیش کر سکوں۔

(حکیم) سید علی حمید زیدی۔ ڈی۔ آئی۔ ایم۔ ایس

سکندر پور فیض آباد۔ یو پی

۱۸ مئی ۱۹۷۰ء



# عرض حال

یہ چند سطر میں بطور گزارش احوال واقعی کے لکھ رہا ہوں۔  
 (اسکندر پور) جو میرا وطن بھی ہے اور شاید مدفن بھی یہی ہو، یہاں  
 کی پورے سال کی مجلسیں پڑھنے کی ذمہ داری لوگوں نے  
 میرے اوپر ڈال رکھی ہے۔ اور بارہ تیرہ سال سے میں اس  
 فریضہ کو انجام دے رہا ہوں۔ روزانہ کے سننے والوں کے سامنے  
 کیا پڑھا جائے کہ بیان میں جاؤ بیت بھی باقی رہے۔ یہ ایک  
 اہم مسئلہ تھا لیکن بارگاہ اہلبیت سے کوئی خالی ہاتھ واپس  
 نہیں ہوتا اس لئے یہاں کیوں محروم رہتا۔ کھوڑا بہت مطالعہ  
 جس میں صرف اردو کی کتابیں میرے لئے ممکن تھیں، کچھ مجالس  
 کے سننے کا فیض جن میں سرکار سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب  
 کی مجلسیں سرفہرست ہیں، کھوڑی بہت دوتوں کی بات چیت



اور وہ بھی برادر حمید رندی صاحب نقوی جیسے دوستوں سے  
 گفتگو کی جن کی ذہانت کا اعتراف ان کے مخالفین تک کو  
 ہے۔ باقی کچھ اپنی دماغی کاوش اور سب پر طرہ مولا کی دینا ہے  
 جن کی مدد سے سکندر پور کی مجلسیں تیار ہوئیں اور ان مجلسوں کے  
 بعد میری پہلی کتاب پاسان مشیخت لکھی جاسکی اور اب یہ  
 دوسری کتاب ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کا مشق  
 حال کر رہا ہوں۔ اس میں غلطیاں بھی ہیں اور علمی مواد کی کمی  
 بھی۔ لیکن میں نے احادیث اور مشہور واقعات کو درایت کی  
 روشنی میں دیکھنے کی ایک کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں میں کہاں  
 تک کامیاب ہو سکا ہوں، اس کا فیصلہ تو پڑھنے والے ہی  
 کریں گے لیکن مجھے اعتراف حقیقت کے طور پر ان تمام لوگوں کا  
 شکریہ تو ادا کرنا ہی ہے جن سے میں محسوس یا غیر محسوس طور پر متاثر  
 ہوا ہوں۔ ابن حسین صاحب نقوی سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ کی اس  
 سخی مشکور کو جو انھوں نے سرکار سید العلماء کی کتابوں کو شائع



کر کے بہت سے لوگوں کی (جس میں میں خود بھی ہوں) مشکلات کو دور کیا ہے کون بھلا سکتا ہے؟ سرکار سید العلماء نے جو کچھ اس دور کو دیا ہے اسے اس عہد کے لوگ اسی وقت فراموش کر سکتے ہیں جب وہ محسن کش ہو جائیں گے۔ برادر محمد مصطفیٰ حسین صاحب زیدی جن سے مجھے اپنی ادبی غلطیوں کی اصلاح میں مدد ملی تھیں۔ محترم برادر ڈاکٹر ابو الحسن صاحب رضوی (محترمہ بانو سید پوری کے شوہر) اور بھائی حیدر محمدی صاحب رضوی پوری جن سے مل کر ذہن کو ایک روشنی ملتی ہے، اور سکون بھی۔ یہ سب حضرات میرے شکر کے مستحق ہیں۔





## احادیث رسالتیہ سے بچے پر واہی

وفاات حضرت ختمی مرتبت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فوراً بعد مسلمانوں نے ہر خلافت کو مستحکم کرنے کی کوشش کی تاکہ نظم حکومت برقرار رہے اور مسلمان انتشار کا شکار نہ ہوں اس بارے میں یہ اختلاف تو ہے کہ یہ کوشش نیک بنتی ہے کٹی یا بد بنتی ہے لیکن اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اصحاب رسول کے اس اقدام سے پوری امت مسلمہ رفتہ رفتہ ہتھ فرقوں میں تقسیم ہو گئی۔ جس کی وجہ سے آج پوری دنیا اسلام انتشار کا شکار ہے۔ یہ بات پوری ذمہ داری کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر وفات سرور عالم کے بعد حکومت سے زیادہ شریعت کے احکام پر زور دیا گیا ہوتا تو آج یہ انتشار اور اختلاف اتنی شدت سے اور اس قدر نمایاں نہ ہوتا۔ لیکن جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا اور جس کے لیے ہوا یعنی خلافت اور حکومت۔ وہ خلافت بھی بعد میں ضرت یہ کہ اسلام کے دین کو درغدار بنا گئی بلکہ خود ساختہ خلفاء کی بدکرداری



کی وجہ سے اپنی موت آپ مر گئی اس طرح سے اختلافات تو باقی رہ گئے لیکن ذریعہ اختلاف ختم ہو گیا اب پوری امت مسلمہ کا انحصار حکومت و خلافت پر نہیں ہے (اور نہ یہ امور اصول دین میں ہیں) بلکہ صرف دین و شریعت پر ہے اس لئے تاریخ اسلام کا طالب علم بجا طور پر یہ سوچ سکتا ہے کہ شروع ہی میں اگر دین و شریعت کے استحکام پر زور دیا گیا ہوتا تو آج یہ مسلمان شاید اتنے متباہ نہ ہوتے۔ اور رسولؐ کے بعد تاریخ اسلام اتنی داغدار نہ ہوتی۔ جسے بعد میں ختم ہونا تھا اس کی بقا کی انتہائی سعی و کوشش کیوں؟ اور جسے ہمیشہ کے لئے باقی رہنا تھا اس سے اتنی بے پرواہی کیوں؟ یہ دو سوال ہیں جو تاریخ کے پڑھنے والوں کے سامنے ہمیشہ باقی رہیں گے اور اس کا کوئی معقول جواب دینا شاید آسان نہ ہو۔

بعد رسولؐ دین و شریعت کی بقا کا ذریعہ کتاب خدا اور سنت رسولؐ تھی۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ماسوا اہلبیت رسولؐ بھی ہر امت کا ایک مستحکم ذریعہ تھے لیکن بد قسمتی سے یہ ذریعہ اختلافی بنا دیا گیا۔ بہر حال قرآن و سنت کے بارے میں آج بھی مسلمان بالکل متفق ہیں۔ تو جب یہ ذریعہ ہر امت مسلمانوں میں بلا کسی اختلاف کے تسلیم شدہ ہے۔ تو بعد رسولؐ ان ہی دو ذرائع کو کیوں نہ محفوظ کر لیا گیا۔ تاکہ آپس میں کوئی اختلاف نہ ہو سکتا۔ شروع شروع میں تو قرآن کے جمع کرنے پر بھی



اختلاف رہا۔ لیکن جب مسلسل جنگوں میں قاری کثرت سے قتل  
 ہونے لگے اور یہ خون غسوس کیا جانے لگا کہ کہیں قرآن ضائع نہ ہو جائے  
 تو جمع قرآن کی مہم شروع کی گئی اور کسی طرح سے تیسری خلافت میں  
 یہ کام تکمیل کو پہنچا۔ اگرچہ یہ جمع قرآن مطابق تشریل نہیں ہے۔  
 لیکن پھر بھی قرآن کو تلف ہونے سے بچا لیا گیا۔ حالانکہ اگر قرآن  
 مطابق تشریل جمع کیا گیا ہوتا تو آج نہ صرف یہ کہ بہت سی آیات  
 کے ذریعہ ہمیں اس زمانہ کی تاریخ بھی معلوم ہوتی بلکہ قرآن کے ذریعہ  
 بہت سی تاریخی غلطیوں کی اصلاح بھی ہو سکتی لیکن افسوس کہ ایسا  
 نہ ہو سکا۔ حضرت علیؑ کا یہ ارشاد آج بھی موجود ہے کہ میں جانتا ہوں  
 کہ کون سی آیت کہاں کہی، ادکس کے بارے میں اتنی بات ہے لیکن چونکہ  
 اہلبیت رسولؐ کو شروع ہی سے نظر انداز کیا جا رہا تھا اس لئے جمع  
 قرآن کی مہم میں ان سے مشورہ نہ لینا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن بعض ایسے  
 بھی تھے جن کی قرآن دانی نہ تھی کہ بارے میں احادیث  
 رسولؐ واضح طور پر بطور سند پائی جاتی تھیں جیسے عبداللہ بن مسعود  
 وغیرہ ان لوگوں کو نظر انداز کر کے زید ابن ثابت سے قرآن کو جمع  
 کرنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کے علم قرآن  
 کے بارے میں احادیث رسولؐ کے واضح اشارے نہیں ملتے ہیں اس  
 طرح سے احادیث رسولؐ کی اہمیت کو شروع ہی میں نظر انداز کیا  
 جانے لگا۔ یا کم از کم اس مہم کا آغاز ہو گیا تھا۔ قرآن کو جمع کر لیا گیا  
 جس کی وجہ سے آج بھی قرآن کے بارے میں کوئی اختلاف مسلمانوں



میں نہیں پایا جاتا۔ بالکل اسی طرح سے اگر حکومت اسلامیہ قرآن  
 کے ساتھ ساتھ سنت رسولؐ کو بھی محفوظ کر لیتی۔ اور بالکل ابتداء  
 ہی میں ہر طرح سے جانچ پڑتال کر کے صحابہ کی موجودگی میں قول و  
 عمل و تقریر رسولؐ کو محفوظ کر لیا جاتا تو یہ بات یقین کے ساتھ ہی  
 جاسکتی ہے کہ آج مسلمانوں کی حالت موجودہ زندگی سے ہزار  
 درجہ بہتر ہوتی۔ معمول خلافت اور استحواس حکومت کا مقصد اگر  
 اس شکل میں ظاہر ہوتا تو شاید یہ دین کی سب سے بڑی خدمت ہوتی۔  
 لیکن پوری خلافت راشدہ گزرتی مگر اگاہ صحابہ اور برسرِ قضا  
 افراد میں سے کسی کو بھی سنت رسولؐ کے تحفظ کا احساس تک نہ  
 ہوا اور نہ اس کے قلمبند کئے جانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ملک  
 پر ملک فتح ہوئے رہے جغرافیائی حدود میں اضافہ ہوتا رہا۔ تہذیب  
 لشکر مقرر کئے گئے۔ بیت المال کی بنا کی گئی۔ اہم ترین قضیوں کے  
 وظائف مقرر کئے گئے۔ غرضیکہ حکومت دنیا اور ریاست عظمیٰ کے  
 باب میں ہر کام کیا گیا لیکن دین کی اہم ترین خدمت یعنی سنت  
 رسولؐ کے تحفظ کے بارے میں سوچا بھی نہ گیا اور اس کی یادداشتان  
 ماعنی بنی گئی۔ سنت رسولؐ کے قلمبند کرنے کا کوئی تذکرہ ہمیں  
 تاریخ میں نہیں ملتا، ہاں یہ ضرور ملتا ہے کہ احادیث رسولؐ کے  
 یاد رکھنے اور اس کی تبلیغ پر پابندیاں عائد کی گئی تھیں اور لوگوں  
 کو حکم عہدہ پر سزائیں بھی دی گئیں۔ اولیٰ سب کچھ اس دور میں ہوا  
 جسے خلافت راشدہ کا بہترین دور کہا جاتا ہے اور ان شخصیتوں کے



حکم سے ہوا جو بقول مولانا شبلی آسمان اسلام کے ہر ماہ کا مصداق  
مقتضی ہے۔

سنت رسولؐ کو منقبط نہ کرنے کا ہولناک انجام آج سامنے ہے۔  
فقہی مسائل جمہور مسلمین میں امام ابو حنیفہ کے زمانے سے منقبط ہونے  
ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں عہد رسالت کا ادراک کرنے والے لوگ  
دنیا سے اکٹھے چکے تھے۔ اور اب صرف سنی ہوئی باتوں پر دین کا انحصار  
تھا۔ جن لوگوں نے عمل رسالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہی  
لوگ بلا کسی اختلاف کے یہ طے کر سکتے تھے کہ حضور اکرمؐ کس طرح سے  
پیشو فرماتے تھے۔ آیا اس طریقہ سے جیسے شیوخ حضرات دعوہ کرتے ہیں  
یا جس طرح سے جمہور مسلمین۔ یہ بات واضح رہے کہ قرآن مجید میں  
دعوہ کرنے کی کوئی ترکیب موجود ہے لیکن اس کے باوجود امت  
طریقہ دعوہ پر متفق نہیں ہے اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ قرآن میں  
جو واضح ہدایات ہیں وہ بھی ہدایت کے لئے کافی نہیں ہیں جہاں  
ابہام ہے وہاں کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن کی موجودگی  
ہے۔ سنت رسولؐ کی ضرورت ہر حال میں باقی رہے گی۔  
حضور اکرمؐ کس طرح سے نماز ادا فرماتے تھے۔ باقاعدہ کھول کر یا  
بہت باندھ کر۔ اور اگر ہاتھ باندھ کر تو پھر ہاتھ کس جگہ رکھتے تھے۔  
سورہوں کی تلاوت میں بسم اللہ بلند آواز سے کہتے تھے یا نہیں۔  
تشہد پڑھتے تھے یا نہیں اور اختتام نماز پر روئے مبارک کو کس  
طرح گردش دیتے تھے۔



حضرت اکرم روزہ کس طرح رکھتے تھے۔ آیا افطار میں عجلت اور  
سحریں تاخیر یا اس کے برعکس۔

حضرت مناسک حج کس طرح ادا فرماتے تھے۔ امت میں حج  
کے بارے میں جو اختلاف ہے اس میں صحیح کیا ہے۔ یعنی حضور کا  
طرز عمل کیا تھا۔

سنت کے بارے میں حضور کا طرز عمل کیا تھا؟  
تقیہ کے بارے میں تقریر رسول کیا تھی؟ آیا کسی کے عمل تقیہ  
کو حضور نے برقرار رکھا تھا یا نہیں۔

یہ اور ہی طرح کے سینکڑوں مسائل ہو سکتے ہیں جن کے بارے میں  
امت محمدی میں اختلاف ہے لیکن جن صحابہ کرام نے حضور کے  
ساتھ حضور فرمایا تھا نمازیں پڑھی تھیں مناسک حج ادا کئے تھے  
روزے رکھے تھے سفر میں تھیں کیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ ان صحابہ کو  
ہر حال بہ تفصیلات یاد دہنی رہی ہوگی اگر ان بھولنے والے چھوڑ کر  
مزید نیچے سے ان تمام باتوں کو جو سنت رسولؐ میں داخل تھیں  
تحریری طور پر محفوظ کر لیا ہوتا تو ان کی یہ خدمت ایران و شام اور  
روم کی فتح سے زیادہ کارآمد اور مفید ہوتی اور قیام حکومت میں  
عجالت اور اتنی عجلت کہ اسے دفن رسولؐ پر ترجیح دی جائے ایک  
نیکوئی غلطی تو ہو سکتی تھی لیکن اس کے مابعد کے اثرات مفید بھی  
ہو سکتے تھے۔

روم میں آج اسلام کا نام نشان تک نہیں۔ اپنی میں



مسجد قرطبہ اپنی حالت پر خود گریاں ہے۔ شام میں اسلام کا جو  
حشر ہوا اس پر نام نہاد مسلمان بھی شرمندہ ہے۔ ایران میں بھی  
جمہور مسلمین کے نقطہ نظر سے کوئی اچھا اسلام نہیں ہے۔ ترکی میں  
بھی مصطفیٰ اکمال کے ہاتھوں خلافت سپرد خاک کر دی گئی۔  
غرضیکہ فتوحات کے عبرتناک نتائج سامنے ہیں اور مدت بھول  
سے بھی بے پرواہی کر کے اختلاف امت کا بیج بھی بویا گیا جواب  
پوری طرح بار آور ہو چکا ہے۔ یہ ہے بعد رسولؐ اٹھایا ہوا کرام کی وہ  
غلطی جس سے اسلام ہمیشہ متاثر رہے گا اور صحیح اسلام کے راستے  
سے مسلمان ہمیشہ ہٹتا رہے گا۔

کہا جاسکتا ہے کہ اگر سب بھول گئے یا عمدہ نظر انداز کر گئے  
تھے تو اہلبیتؑ رسولؐ اور بالخصوص حضرت علیؑ نے اس فریضہ کو  
کیوں نہ انجام دیا۔ اس کا میرے پاس بالکل سیدھا سا جواب یہ ہے کہ  
دفن رسولؐ کے بعد حضرت علیؑ کا ایک ہی اعلان تھا کہ میں اپنی  
غنیائیں اپنے دوش پر اس وقت تک نہ ڈالوں گا جب تک قرآن کو  
جمع نہ کر لوں۔ اسٹی کام حکومت کے نقاد خانہ میں اس مرد حق پرست  
کی یہ آواز اگرچہ قابل اعتناء نہ سمجھی گئی لیکن تاریخ نے ہم تک اس  
آواز کو پہنچا دیا ہے۔ چنانچہ جب اعلان حضرت علیؑ نے قرآن کو  
مطابقت تنزیل جمع بھی کیا اور اسے پیش بھی کر دیا۔ مگر حکومت نے  
قبول نہ کیا۔ اب مولانا کائناتؒ نے اپنا قرآن اس لئے شائع نہ  
کیا کہ اس کے نتائج کر دینے کے نتیجہ میں عالم اسلام میں قرآن بھی



اختلافی شے بن جاتا اس لیے انہوں نے اسلام کو دو قرآنوں کی موجودگی  
 کے خطرہ سے بچا لیا۔ اگر موجودہ قرآن مطابق تنزیل ہوتا تو آج  
 قرآن کے ذریعہ سے اس زمانہ کے بہت سے صحیح تاریخی واقعات بھی  
 معلوم ہو سکتے اور بہت سی تاریخی غلطیوں کی اصلاح بھی ہوتی رہتی  
 برسر اقتدار افراد نے شاید انہیں خطرات کے پیش نظر علیؑ کے پیش کردہ  
 قرآن کو قابل پذیرائی نہ سمجھا۔ اب امیر المومنین علیؑ ابن ابیطالبؑ  
 احادیث رسولؐ کو کس امید پر بچا کر کے امت کے سامنے پیش کرتے  
 جب اللہ کا کلام علیؑ کے ذریعہ حکومت نے قبول نہ کیا تو رسولؐ کا  
 کلام علیؑ کے ذریعہ کیسے قبول کیا جاسا جبکہ کلام رسالت کا بیشتر حصہ  
 خود علیؑ اور اہلبیتؑ رسالت کی مدح و ثنا کے بارے میں تھا۔ یہ  
 تو گویا خود اپنی کہانی رسولؐ کی زبانی پیش کی جاتی یا گویا بالفاظ  
 دیگر اپنا قصیدہ خود پیش کرنا ہوتا۔ ظاہر ہے کہ علیؑ خود یہ نہیں کر سکتے  
 تھے جبکہ اتمام حجت کے تمام منازل خود سرد عالم طے فرما چکے تھے۔  
 پھر ان احادیث رسولؐ کو جو اہلبیتؑ کے بارے میں تھے اگر یہ خود  
 پیش کر دیتے تو ان احادیث کی نوعیت واضح طور پر سیاسی بنیادی  
 جاتی اور وہ خفیہ طاقت جو ان احادیث میں تھی لوگ اس سے  
 واقف ہو جاتے اس لیے اب علیؑ نے سب کچھ مشیت اور قدرت پر  
 چھوڑ دیا اور وہی ہوا، مشیت ایزدی کے تحت ہزار ہا مخالفین کے  
 باوجود اہلبیتؑ رسولؐ کے فضائل محسوس اور غیر محسوس طور پر جمہور  
 مسلمین کی کتابوں میں درج ہو گئے خدا خود محافظ حقیقی ہے اس نے



ان احادیث کی ہر حال میں حفاظت کی گئی۔ اور میرے خیال میں  
یہی ایک واضح سبب ان کے احادیث رسولؐ کے نہ جمع کرنے کا موجود  
ہے۔ حالانکہ اور بھی بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر  
ان کے پیش کردہ احادیث قابل قبول ہو جاتے تو حکومت پر قائم  
رہنے کے لئے کیا وجہ پائی رہ جاتی اور اگر باب اقتدار اس طرح اپنے  
عمل کے لئے جو از پیش کرتے۔ اسی لئے سنت رسولؐ سے غفلت اور  
قرآن بلا مطابق تنزیل جمع کئے جانے کا دائرہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں ہو  
اگرچہ اس کے نتائج پوری ملت اسلامیہ کے لئے بڑے ہی اندھناک  
ہوئے۔ سنت رسولؐ کا ان لوگوں کی زندگی میں محفوظ نہ کیا جانا  
جنہوں نے قولی رسالہ کو اپنے کانوں سے سنا تھا اور عمل رسالہ کو  
اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مستقبل کے اسلام کے لئے تباہ کن ثابت ہوا  
بعض کے اثرات قیامت تک باقی رہیں گے۔ اس ایک غفلت یا  
غلطی سے فائدہ اٹھا کر رسولؐ کا نام لے کر فرضی حدیثیں وضع کی گئیں  
پیشانیچہ وضعی احادیث کا اخبار لک گیا۔ شروع شروع میں تو فرضی  
احادیث کی آواز کا ڈکھائی دیتی تھی۔ لیکن بعد میں تو احادیث  
کی کوئی انتہاء نہ رہی۔ حضرت عمر جناب ابو ہریرہؓ کو احادیث کی کثرت  
بیان پر زرد و کوب کرتے ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ بھی انہیں بار  
بار اعتراض کرتی ہیں کہ تم جنگ خیبر کے بعد اسلام لائے پھر تم کس طرح  
اسی کثرت سے احادیث کی روایت کرتے ہو۔ جناب فاطمہؓ زہراؓ  
حدک میں حضرت ابوبکرؓ پر حدیث لا نورث کے سلسلہ میں اعتراض



فرماتی ہیں اور یہ کہتی ہیں کہ یہ حدیث اس لئے غلط ہے کہ معارضہ قرآن ہے۔ غرضیکہ یہ ابتدائی آواز میں کھٹیں ایسی صورت میں ایسی حکومت کے لئے جو محافظہ شرع میں رہنا اور حامی دین میں کھلائی کھتی اور بھی لازم ہو جاتا تھا کہ وہ سنت رسولؐ کو پوری احتیاط کے ساتھ نقل و بردار کر لیتی۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اور جیسے جیسے عہد رسالت کے لوگ اٹھتے گئے احادیث کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا حدیث بیان کرنے والا نہ رہا۔ حدیث گڑھنے والے بڑھتے گئے اور احادیث کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ جسے بھی اسلام کی تاریخ سے دیکھی ہوگی وہ اس حقیقت سے باخبر ہو گا کہ بنی امیہ کے عہد اقتدار میں کشتی کثرت سے حکومت کے زیر سایہ اور حکومت کے حکم سے اس وضع احادیث کے جرم عظیم کا ارتکاب کیا گیا۔ امام بخاری نے چار لاکھ حدیثوں میں سے چھ ہزار سے زائد حدیثوں کا انتخاب کیا جسے وہ صحیح بخاری میں درج کرنے کے قابل پائے۔ اس کے باوجود صحیح بخاری جیسی کتابوں سے کسی بد نیت کو رنگیلا رسول جیسی کتابوں کے لکھنے میں مدد ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حدیثوں کے وضع کرنے والے غیر مسلم نہ تھے۔

آنکہ کافر ٹکنندہ اسچہ مسلمان کر دند

نہ صرف احادیث رسولؐ بلکہ سنت رسولؐ کی اہمیت کو بالکل ابتداء ہی میں یہ کہہ کر کم کر دیا گیا تھا کہ ہمارے لئے کتاب خدا کافی ہے۔ حالانکہ یہ فقرہ خود یہ بتا رہا ہے کہ کہنے والے کے ذہن میں رستہ ہدایت کے لئے قرآن کے سوا کچھ اور ذرائع بھی موجود ہیں جن کو



ہنگامی حالات کا فائدہ اٹھا کر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اگر کوئی  
 مجبوری ہوئی تو کافی پر اکتفا کیا جاسکا۔ سمجھ میں آنے والی بات تھی  
 لیکن بلا سبب دوسرے ذرائع کو نظر انداز کرنا ان ذرائع کو سبک  
 سمجھنا ہے جس میں خود سنت رسولؐ بھی شامل ہے۔ قرآن کسی حال  
 میں بھی کافی نہیں۔ مثال کے طور پر دن میں پانچ بار پڑھی جائیوالی  
 نماز ہی کی کوئی ترکیب قرآن میں نہیں ہے۔ اس کے لئے ہر حال سنت  
 رسولؐ کا سہارا لینا ضروری ہے۔ وہ لوگ جو بعد رسولؐ موصوم سلسلہ  
 رشد و ہدایت کو بغیر تسلیم کرتے ان کے لئے اور بھی یہ ضروری تھا کہ  
 وہ سنت رسولؐ کا تحفظ قرآن کے ساتھ ساتھ کرتے تاکہ قرآن کے  
 اجمال کو عمل رسولؐ کی تفصیل کی روشنی میں واضح کیا جاسکتا جس پر  
 امت بعد رسولؐ عمل پیرا ہو کر صراطِ مستقیم پر چل سکتی۔ قرآن رسولؐ  
 کریمؐ کا معجزہ ہے اور معجزہ کی اہمیت ہر حال میں صاحبِ معجزہ کے  
 بعد ہوگی۔ جناب موسیٰؑ و جناب عیسیٰؑ کے ثبوت نبوت کے معجزات  
 ان کی حیات کے ساتھ ختم ہو گئے لیکن جب تک دوسرا نبی آکر  
 پہلی شریعت کو منسوخ نہ کر دے پیغمبر کے بعد سابقہ نبی کی شریعت کا  
 نفاذ ہوتا رہے گا۔ حالانکہ اس نبی کا معجزہ اب باقی نہیں ہے جس نے  
 ثبوت نبوت میں پیش کیا تھا۔ اسی صورت میں سابقہ نبی کی شریعت  
 اس کے کردار و عمل کی صورت میں نافذ رہے گی۔

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والا دین جب آیا تو رسولؐ  
 اپنا معجزہ کتاب کی شکل میں لائے تاکہ دین کے ساتھ کتاب بھی



باقی رہے لیکن جب کتاب کافی ہو اور رسول کا کردار عمل غیر ضروری  
 سمجھا جائے یہ رسول کے ساتھ ظلم عظیم ہے۔ جبکہ وہ کتاب خود  
 کسی ایک مسئلہ کے بارے میں اپنے کافی ہونے کا اعلان بھی نہ  
 کرتی ہو بلکہ سرکارِ سید العلماء کی نغفلت یہ کہنا بالکل صحیح ہو گا کہ  
 قرآن اترا ہی اس صفت میں ہے کہ وہ نا کافی ہے۔ لیکن بہر حال  
 اس جملہ سے کہ قرآن ہمارے لئے کافی ہے سنت رسول اور  
 اہلبیت رسول سے بے پروائی کی داغ بیل پڑتی ہے کافی سمجھا  
 گیا اسے جمع کر لیا گیا اور جو غیر ضروری سمجھا گیا اسے نظر انداز کیا  
 گیا۔ جس کے نتیجہ میں لاکھوں فرعی حدیثیں عالمہ جو میں آئیں اور  
 اس طرح سنت رسول کو شہید کیا گیا۔ اور اہلبیت رسول کے ساتھ  
 جو سلوک کئے گئے اس پر انسانیت کی تاریخ ہمیشہ گریاں رہے گی  
 اگر شروع میں جمع قرآن کے ساتھ ساتھ سنت رسول کو قید و بند  
 میں لایا گیا ہوتا تو آج پوری امت اسلامیہ ایک ہی طرح سے  
 نمازیں پڑھتی ہوتی۔ ایک ہی اوقات میں اذان سے گھولتی ایک ہی  
 طرح سے حج کرتی ہوتی۔ ایک ہی فرقہ کے چار چار امام نہ ہوتے بلکہ  
 ایک ہی امام ہوتا اور وہ معصوم امام یعنی خود ذات رسالت صلی اللہ  
 علیہ وآلہ وسلم ہوتی۔

غرضیکہ یہ اختلافات جن کی جھلکیاں قدم قدم پر آج غیروں  
 اور اپنوں دونوں کو مستشدد پریشان کرتی ہیں نہ پائی جاتیں اور  
 پوری امت اسلامیہ اپنے مہول و فروع کے ساتھ ساتھ اپنے عمل



میں بھی یکساں ہوتی۔ میں ان انفرادی کوششوں سے جو حجِ حدیث  
 کے سلسلہ میں مواذینِ جبل وغیرہ لے کر ہیں واقف ہوں۔ لیکن میرا  
 اعتراض یہ ہے کہ حکومت و ذمہ دارانِ خلافت کو اسے کرنا تھا۔  
 انفرادی کوششیں ناکامی پر ختم ہوئیں۔  
 لیکن افسوس کہ ذمہ دارانِ خلافت نے سنتِ رسولؐ اور  
 اہلبیتِ رسولؐ سے بے پرواہی برتی جس کی وجہ سے امت نے دوزخ  
 کے ساتھ بدترین سلوک کئے۔ حنفی حدیثوں سے صحیح احادیثِ کثرت  
 کو مشکوک بنایا گیا اور اہلبیتِ اہلِ بیت کے ساتھ جو سلوک کیا  
 گیا اس سے تاریخِ اسلام ہمیشہ داغدار رہے گی۔ اب اس کے سوا کوئی  
 چارہ نہیں رہ گیا کہ صحیح احادیث کو غلط حدیثوں سے علیحدہ کر کے  
 اصلاح کی کوشش کی جائے قابلِ ستائش ہیں سچد کے وہ علماء  
 جنہوں نے اپنی علمی کاوشوں سے ایک نئے علم کی بنیاد ڈالی اور  
 اس طرح علمِ رجال کے ذریعہ صحیح احادیث کے انتخاب کی کوشش  
 میں بڑی حد تک کامیابی حاصل ہو سکی۔ پھر بھی احادیثِ رسولؐ  
 کے بارے میں ہمیشہ اختلافات باقی رہیں گے۔ اور ان اختلافات  
 کے نتیجہ میں امت راہِ ہدایت سے ہٹکتی رہے گی۔ اسلام کے علماء  
 نے پہلی صدی ہجری کے بعد اس طرح سے دین کے لیے جو کامیابی کی  
 ہیں وہ عہدِ خلافت کے فرائض تھے لیکن خلافت نے اپنے فرائض کا  
 عشرِ عشر نہ پورا کیا۔ آج دنیا خلافت سے خالی ہے۔ اکابرِ صحابہ کی  
 تیار کردہ حکومت کی عمارت کی اسینڈل سے اینٹ نہ بچ چکی ہے



لیکن دنیا دین سے بہر حال خالی نہیں ہے۔ علماء اسلام کے خدشات باقی ہیں۔ کتاب خدا سنت رسولؐ اور اہلبیتؑ کی بدولت اسلام کی سمیع مخالفت کی ہزار ہا آندھیوں کے جھوکوں کے بعد بھی روشن ہے۔ اور انتشارِ اشد ہمیشہ روشن رہے گی۔ اب دنیا خود یہ فیصلہ کرے کہ علماء اسلام کے خدمات زیادہ دینیج ہیں یا خلفاء اسلام کے خدمات۔ کس کے خدمات کے مل پر اسلام کی کشتی مخالفت کے طوفانوں میں بھی رواں دواں ہے۔ اگر احادیث رسولؐ نہ ہوتے تو صحیح اسلام کا تصور بھی نہ ہوتا۔ اگر اہلبیت رسولؐ نہ ہوتے تو حقیقی اسلام کو بچایا ہی نہ جاسکتا تھا۔ خلافت کے زینہ سے برید جیسے لوگ اسلام کے حکمران بنے۔ اہلبیتؑ کی قربانی کی بدولت کربلا میں حکومت اور شریعت کو علیحدہ کیا جاسکا اور دنیا کو فیصلہ کن انداز میں یہ بتا دیا گیا کہ خلیفہ ہونا اور ہے اور محاذ شرعی ہونا اور بات ہے اس لئے شریعت کو خلافت سے بہر حال الگ ہونا چاہیے۔ شریعت کو تابع خلافت نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ انسانوں کی مشترکہ کوششیں کسی شخص کو خلیفہ تو بنا سکتی ہیں لیکن اسے فی الواقع صاحبِ کردار اور محافظِ اسلام نہیں بنا سکتی ہیں۔

علماء اسلام کے خدمات کی بدولت سنت رسولؐ کا تحفظ ہو سکا اور اس طرح احادیث رسولؐ کے ذریعہ اہلبیت رسولؐ کے معارف بھی سامنے آئے قول رسولؐ اور عمل اہلبیتؑ کی روشنی میں



اسلام کے حقائق نمازاں ہوتے جس کی بدولت اصول اور فروع اسلام  
 کا تحفظ ہو سکا اور صحیح عقائد اسلامی کو سمجھا جاسکا۔ اب اس  
 پس منظر میں کیوں نہ احادیث رسولؐ کے ذریعہ اس عہد کی صحیح  
 تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے اور صحیح اسلامی عقائد کو  
 کیوں نہ سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ میرا زیر نظر مقالہ اسی نقطہ  
 کے پیش نظر ہے۔ میں نے غلوؤں دل سے صحیح احادیث رسولؐ کی  
 روشنی میں تاریخ اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے کہ تاریخ  
 غلط ہو سکتی ہے اگر وہ صحیح احادیث کے موارد میں تو یہ سمجھا ہوتا  
 کہ بعض احادیث سے نہ صرف یہ کہ عہد رسالتؐ کی تاریخ بھی معلوم  
 ہوتی ہے بلکہ بہت سی تاریخی غلطیوں کی اصلاح بھی ممکن ہے۔ یہاں  
 طرح بہت سے وہ غلط نظریات اور عقائد جو مسلمانوں میں رائج  
 ہیں صحیح احادیث کی روشنی میں انھیں بھی درست کیا جاسکتا ہے۔  
 ہادی عالم کے احادیث پر اگر ایک نگاہ ڈالی جائے تو احادیث  
 کا بیشتر ذخیرہ اہلبیتؑ کے بارے میں ملے گا۔ بنی امیہ و بنی عباس  
 کی مشرکہ کوششوں کے باوجود فضائل اہلبیتؑ کو مٹایا نہ جاسکا۔  
 جو احادیث اہلبیتؑ کی شان میں ہیں ان کا ظاہری رخ ایسا معلوم  
 ہوتا ہے جیسے سرور عالمؐ اپنے اہلبیتؑ سے اظہارِ نجات فرما رہے  
 ہیں۔ کسی حدیث میں اپنے تعلق کا اظہار کیا گیا ہے۔ کسی حدیث میں  
 اسراشتہ بیان کیا گیا ہے۔ کسی حدیث میں کسی کی کوئی فضیلت بیان  
 کی گئی ہے۔ کسی حدیث میں اپنے روح و جسم کی انتہائی قربت کا



اظهار کیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مثال کے طور پر کچھ احادیث اس طرح کے ہیں۔

حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ حسینؑ کا خون میرا خون حسینؑ کا گوشت میرا گوشت ہے۔ علیؑ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔

سیدہ میرا ایک جزو ہے جس نے اس کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔

ان تمام احادیث میں اپنا مشتمل اپنے جسم داپنی روح کا تعلق اپنا بے پناہ محبت کا بظاہر اظہار مقصود ہے۔

حسنؑ و حسینؑ جو اتان اہل جنت کے سردار ہیں۔ یہ شاہزادوں کی خصوصی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ علیؑ حق کے ساتھ اور حق علیؑ کے ساتھ۔ اس میں علیؑ اور حق کا ایک دوسرے سے تعلق بیان کیا گیا ہے۔

مسلمان ہم اہلبیتؑ میں سے ہیں اس میں ایک صحابی کی غلطی کا اظہار ہے اور اس طرح کی بہت سی حدیثیں ہیں اپنے تعلقات بیان کئے گئے ہیں لیکن اگر غور سے ان احادیث کا جائزہ لیا جائے تو بات کچھ اس سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر رسولؐ اپنے بچوں کا یا اپنے بھائی کا تعاقب کر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرور عالم اسلام کے دہنوں کا تعاقب کر رہے ہیں۔ ان احادیث میں مستقبل کی تاریخ یہی ہے۔ تاریخی غلطیوں کی اصلاح بھی ان



احادیث کے ذریعہ کی جا رہی ہے۔ بشرطیکہ ہم نیک نیتی سے حقائق کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ "اعطیت جنوا مع الکلم" یعنی مجھے جو امت کلمات کی خصوصیت عطا کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بات بظاہر ایک ہی ہو لیکن اس کے بہت سے رخ ہیں اور ہر ایک حق ہے یہ خصوصیت احادیث و احادیث میں بیکر نمایاں ہے جس طرح حدیث کو آپ چاہے اسی خصوصیت پر مرکب لیجئے۔ میں نے بھی کچھ حدیثوں کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے تو مجھے عجیب سی روشنی ملی ہے۔ جس سے مجھے اپنے یقین کو اطمینان قلب میں بدلنے کا موقع ملا ہے، انھیں خیالات کو میں اس کتاب میں پیش کر رہا ہوں۔ اگر کسی ایک آدمی کو بھی اس کے پڑھنے کے بعد حقائق کے سمجھنے میں مدد ملی تو میں اپنے کو کامیاب سمجھوں گا اور یہ اطمینان ہو جائے گا کہ مجھے اپنی کاوشوں کا صلہ مل گیا۔

## احادیث سے تاریخ کی اصلاح

### پہلی حدیث

۱! ارشاد حضرت سرور عالم کہ "سیدہ میرا جزو حصہ ہے جس نے اس کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی" صحیح بخاری نے اس حدیث کو یہیں تک لکھا ہے۔ دوسرے کتب احادیث میں اس کے بعد یہ بھی ہے کہ "جس نے مجھے اذیت دی اس نے اللہ کو اذیت دی اور جس نے اللہ کو اذیت دی وہ کافر ہو گیا" امام بخاری نے ان ٹکڑوں کو



نہیں درج فرمایا ہے لیکن اس سے اہل حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ اس لئے کہ بعد کے فقرات نتیجہ عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔ حدیث کی جان تو پہلا ہی حصہ ہے جسے میں نے اوپر درج کیا ہے۔ اور جسے امام بخاری نے صحیح بخاری میں درج فرمایا ہے "سیدہ میراجہ رحمہ" ہے جس نے اسے اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔"

اس حدیث کے نتیجہ میں بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں جس پر غور کرنا ضروری ہے۔

بجواب سیدہ کا نام لے کر ہادی عالم نے کئی اور حدیثیں ارشاد فرمائی ہیں جو بہت مشہور ہیں۔ "اگر میری بیٹی سیدہ بھی پوری کرے تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دوں گا" اور دوسری حدیث "سیدہ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں" تیسری حدیث "سیدہ دنیا کی عورتوں کی سردار ہیں" اور چوتھی حدیثیں جو مجھے نہ معلوم ہوں۔ ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول خدا صاحب خلق عظیم پیغمبر افک نعلی خالق العظیم۔ ارشاد حضرت اعدیت ہے۔ آپ کے اخلاق حسنہ سے نہ صرف اپنے کو بلکہ غیروں کو بھی فیض پہنچتا رہتا۔ حدیث کہ جان کے دشمن افراد کبھی آپ کے اخلاق کے معترف تھے۔ صحابہ کے پاس میں آپ کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ صحابہ رات کو دیر تک حدیث رسالت میں گفتگو کرتے رہتے یہاں تک کہ حضور کے لئے نماز شب ادا کرنے کا وقت آجاتا اور اس طرح آپ کو تمام رات بیداری ہی کے عالم میں گزارنا پڑتی۔ حضور نہ جانے کتنے دنوں تک یہ تکلیف برداشت



کرتے رہے لیکن اپنی زبان سے کچھ نہ فرمایا یہاں تک کہ بذریعہ وحی  
 خالق نے صحابہ کی اس ہولناک شہادت کا سد باب کیا تاکہ آپ کو آرام کا  
 موقع ملے۔ اسی طرح باوجود اذیت گفتگو پر بھی آپ نے صحابہ کو نہ منع کیا۔  
 بذریعہ وحی اس پر بھی پابندی عائد کی گئی۔ یہ روزانہ کی زندگی کے ایسے  
 حادثات ہیں جو آپ کی طبیعت نازک پر بار دہا کرتے تھے لیکن آپ نے  
 اذراہ اخلاص اپنی زبان سے کچھ نہ فرمایا۔ نصاریٰ بنی بھران کے لئے  
 مسجد کے کچے فرش پر آپ سے اپنی عبا کا فرش بچھا دیا۔ وغیرہ وغیرہ  
 ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔ اخلاص حسنہ کی اس نمونہ کے بعد اولاد  
 کے بارے میں آپ کے اخلاص کا مساوی طور پر مظاہرہ نہ ہوتا  
 حیرت انگیز بات ہے۔ عام تاریخ نے سرور عالم کی تین لڑکیاں پیش  
 کی ہیں جو سب کی سب ام المومنین حضرت خدیجہ کے بطن سے بتائی  
 گئی ہیں۔ ایک ہی ماں باپ کی اولاد اور ایک ہی آغوش تربیت  
 ایک ہی مرکز محبت غرضیکہ سب کچھ ایک لیکن رسول اکرم جناب سیدہ  
 کے بارے میں نام لیکر بار بار احادیث اور شاہ فرماتے ہیں باقی دونوں  
 بیٹیوں کو نظر انداز فرماتے ہیں۔ یہ دونوں بیٹیاں بعد میں حضرت عثمان  
 جیسی شخصیت کے ساتھ یکے بعد دیگرے بیاہی گئیں جو اسلام کے  
 تیسرے خلیفہ بھی ہیں۔ اور جمہور مسلمانوں کے نزدیک ایک عظیم المرتبت  
 شخصیت بھی۔ اگر فضیلت باعتبار خلافت صحیح سمجھی جائے تو ان کو حضرت  
 سے افضل بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ مگر ان سب کے باوجود زبان رسالت  
 اپنی ان دونوں بیٹیوں کے بارے میں خاموش ہے۔ تعظیم کے لئے اگر



رسولؐ اٹھتے ہیں تو حضرت جناب سیدہؓ کی۔ سرور عالمؐ نے کبھی کسی کی تعظیم  
 نہ کی۔ نہ مردوں میں کسی کی نہ غورتوں میں کسی کی۔ لیکن یہ مشترک حضرت  
 جناب سیدہؓ کو حاصل ہے۔ مدینہ منورہ میں کہیں سے اگر آئے تو پہلے  
 جناب سیدہؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ اگر کہیں جا رہے تھے تو آخر میں جس  
 گھر سے رخصت ہوئے وہ گھر جناب سیدہؓ کا تھا۔ کسی دروازہ پر جا کر  
 اگر سلام کیا تو وہ دروازہ جناب سیدہؓ کا تھا۔ یہ معمول حیات بخیر تھی  
 امتصار کے اگر ہے تو حضرت جناب سیدہؓ کے لئے۔ اسی مدینہ میں حضرت  
 عثمانؓ کا گھر بھی ہے۔ اسی گھر میں سیدہؓ کی ایک بہن بکلی ہے۔ حسن سلوک  
 کے یہ مظاہرے اس کے لئے کیوں نہیں ہاں نہ تو اس کے دروازہ پر جا کر  
 رسولؐ کے سلام کی آواز سنائی دیتی ہے۔ نہ اس بیٹی کے لیے ایک با  
 بھی رسولؐ تعظیم کے لئے گھر سے ہوتے ہیں نہ اس بیٹی کے ہاں سے ہیں  
 احادیث رسالتؐ سنائی دیتے ہیں۔ نہ تو مدینہ سے جہالتے ہوئے  
 سب سے آخر میں اس بیٹی کے گھر سے رخصت ہوتے ہیں اور نہ وہاں سے  
 اس کے گھر پر تشریف لائے ہیں۔ اس بیٹی کا شوہر وہ ہے جو اسی شہر  
 کے مشرک سے ذوالنورین کا لقب رکھتا تھا ہے ظاہر ہے کہ اگر یہ دونوں  
 خواتین حضرت عثمانؓ سے منسوب نہ ہوتی ہوتیں تو انھیں یہ خطاب نہ ملتا۔  
 یہ احادیث ہے کہ پہلے کفار سے بھی یہ اعزاز دیاں منسوب ہو چکی  
 تھیں۔ خیر اس سے اس وقت بکثرت کا محفل نہیں ہے۔ لیکن بنیادی  
 سوال حضرت یہ ہے کہ ایک ہی رشتہ ایک ہی ماحول ایک ہی صلب  
 ایک ہی بطن اور یکساں تربیت کے باوجود پیغمبرؐ کا عمل کتنا مختلف ہے



ہر وہ شخص جسے پیغمبر کی سیرت سے دلچسپی ہو سکتی ہے اس کے لئے پیغمبر کی  
 سیرت کا یہ تضاد حیرت انگیز ہے کہا جاسکتا ہے اور یہ کہنا حق بجانب  
 بھی ہے کہ جناب سیدہ شرف میں ہر حال سب سے افضل ہیں اور دنیا  
 کی کوئی خاتون مقام شرف میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس لئے  
 وہ اپنی بہنوں سے بھی افضل ہیں اس لئے احادیث میں ان کا تذکرہ  
 ان کے خصوصی شرف کی بنا پر ہے۔ یہ جواب یقیناً بہت دزن رکھتا ہو  
 لیکن اس جواب کے نتیجہ میں دوسرا سوال پھر خود بخود پیدا ہو جائے  
 گا۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اگر احادیث رسالتؐ جو جناب سیدہ کے  
 بارے میں ہیں بر بنار شرف و فضیلت ہیں تو عمل رسالتؐ کس بنا پر  
 ہے۔ یعنی تعظیم کرنا۔ باہر سے آنے کے بعد سب سے پہلے جناب سیدہ سے  
 ملنا اور مدینہ سے جاتے ہوئے سب سے آخر میں جناب سیدہ سے  
 رخصت ہونا یہ سب کس بنا پر ہے یہ بشریت کے تقاضے ہیں یا رسالت  
 کے۔ اگر بشریت کے تقاضے ہیں تو دوسری بیویوں کے لئے کیوں نہیں  
 کیا معاذ اللہ اس سے اخلاق پیغمبرؐ پر حرف نہیں آتا۔ اور اگر یہ سب  
 بر بنار رسالت ہے تو پھر اولاد کی کتنی ہی کیوں نہ ہوں شرف اور  
 فضیلت اصل چیز ہے۔ ہم کسی کی تعظیم بر بنار شرف کرتے ہیں صرف بر بنار  
 نسبت نہیں کرتے۔ ورنہ جناب آدم و نوح و یعقوبؑ کی ہر اولاد کی  
 بلا کسی استثناء کے تعظیم کرتے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احادیث رسالتؐ یقیناً جناب  
 سیدہ کے لیے بر بنار شرف ہیں لیکن وہ حدیث جس میں سرور عالمؐ نے



یہ ارشاد فرمایا ہے کہ "میری بیٹی سیدہ بھی اگر چوری کرے تو میں اس کا  
 بھی ہاتھ کاٹ ڈالنے کا حکم دوں گا" اس حدیث میں ظاہر ہے کہ  
 جناب سیدہ کے لئے کسی شرٹ کا اظہار نہیں ہے۔ بلکہ فقہ اسلامی کے  
 ایک حکم کے نفاذ کے سلسلہ میں عمل رسالت کی سختی کا اظہار ہے جس  
 میں اپنے سے قریب ترین بستی تک کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ ہر وہ  
 شخص جسے جناب سیدہ سے محبت اور عقیدت ہے اس کا گناہی  
 چاہتا ہے کہ اس جگہ اگر ان کا نام نہ ہوتا تو بہتر ہوتا۔ تو خود رسول  
 اکرمؐ جنہیں جناب سیدہ سے بے پناہ محبت تھی۔ جو اپنی اس  
 بیٹی کو جنت کی عورتوں کی سردار بنانا چاہتے تھے وہ کیوں چوری کی  
 حد جاری کرنے میں بطور مثال ہی اپنی اس بامشرف بیٹی کا نام  
 لے رہے ہیں۔ سردار عالم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ میری بیٹیاں جنت  
 کی عورتوں کی سردار ہیں یا یہ نہیں ارشاد فرما سکتے تھے کہ میری  
 بیٹیاں دنیا کی عورتوں کی سردار ہیں۔ یہ تو ضرور ارشاد فرما سکتے تھے  
 کہ میری بیٹیاں ہیں سے بھی اگر کوئی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ  
 کٹا دوں گا۔ یا حضورؐ یہ بھی ارشاد فرما سکتے تھے کہ میری بیٹیاں میرا  
 جزو ہیں جس نے ان کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔ لیکن  
 اس عام موقع پر بھی رسول اکرمؐ نے اپنی دوسری لڑکیوں کا تذکرہ  
 نہ فرمایا۔ میرے عزیز دوست حمید رحمدی صاحب پرنسپل گورنمنٹ  
 کالج الموڑہ کے بقول محاذ اشدر یا تو سردار عالم اچھے باپ نہ تھے یا  
 سیدہ اچھی بیٹی نہ تھیں۔ اس پورے پس منظر میں اب نتائج کے



طالب علم کے لئے لکھ کر یہ ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ رسولؐ کی تین بیٹیاں  
ہیں اور رسولؐ صرف ایک کا ذکر بار بار فرماتے ہیں۔ خواہ یہ تذکرہ  
مقام شرف میں ہو خواہ اس سے مہٹ کر ہو۔ اس لئے مذکورہ بالا احادیث  
رسالتؐ کی روشنی میں حسب ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ بار بار جناب سیدہ کا ذکر کرنا اور کسی بیٹی کا ذکر نہ کرنا یہ صاف  
بتاتا ہے کہ اگرچہ تاریخ میں رسولؐ اللہؐ کی تین لڑکیاں ظاہر کی گئی  
ہیں لیکن رسولؐ کا عمل رسولؐ کی محبت پوری۔ اخلاقی رسالت۔  
شفقت نبوت۔ غرضیکہ جہاں حرام نبوی اس روایت کی تردید کرتے ہیں  
تاریخ کسی سیاسی بنیاد پر رسولؐ کی لڑکیوں کی تعداد میں  
افساد تو کر سکتی تھی لیکن ان کو رسولؐ کی شفقت نہیں دے سکتی تھی  
رسولؐ کی محبت نہیں دولت کر سکتی تھی جو معیار رسالت کے شایان  
شان ہوتا اور جس کے نتیجے میں رسولؐ کی محبت کے وہ مظاہرے نہ ہوتے  
جو جناب سیدہ کے ساتھ تاریخ میں مخصوص ہیں۔ اسی لئے زبان رسالتؐ  
ہر ایسے شرف کے بارے میں جس کا دین سے تعلق تھا صرف جناب  
فاطمہؓ زہراؓ کے بارے میں داہوتی تھی۔ یہ حدیثیں بہر حال صحیح ہیں۔  
اور رسولؐ کا عمل ان احادیث کے بالکل مطابق بھی ہے۔ اس لئے  
ان کی صحت اور بھی مسلم ہے۔ رسولؐ اکرمؐ کے جناب سیدہ کے سوا دو  
بیٹیاں اور بھی تھیں عمل رسولؐ اس کی مطابقت نہیں کرتا۔ اگر دو  
بیٹیوں کی روایت کو صحیح مان لیا جائے، تو اس سے عدل پیغمبرؐ حروف  
آتا ہے۔ عام حالات میں ایک اچھے باپ کا جو سلوک یکساں طور پر



اپنی تمام اولاد کے ساتھ ہونا چاہیے رسولؐ کا وہ سلوک جناب سیدنا  
 و جناب زینب و جناب دتہ کے ساتھ یکساں نہیں ہے۔ حالانکہ کہاں  
 یہی جانا ہے کہ یہ دونوں بیٹیاں بھی اسی تحفہ اسلام کے لطف سے  
 بھیں جس نے رسولؐ کی وفات میں اپنی کثیر دولت اور عظیم سب  
 کچھ قربان کر دیا تھا۔ یہ بھی نہ تھا کہ رسولؐ اکرمؐ زندگی کے کسی لمحہ میں  
 جناب خدیجہؓ کو بھول گئے ہوں۔ کاشانہ نبوت میں ہر عمر اور ہر صورت  
 و شکل کی خواہش آتی رہی لیکن رسولؐ اللہؐ کے دل میں جناب خدیجہؓ  
 کا جو مقام مرنے کے بعد بھی باقی رہا وہ کسی بومی کا اسکی زندگی میں  
 بھی نہ ہو سکتا۔ جب بھی ذکر آیا آنکھوں میں آنسو ذکر کے ساتھ آئے  
 ان کے جیسی کسی کی آواز بھی تو یہ چین ہو کر کھڑے ہو گئے۔ صورت و  
 شکل عہدہ و منزلت اور غریب و ہر چیز کو نظر انداز کر کے ایک غم سیر  
 نورت کو تاحیات یاد کرتے رہتا اور اس کے تذکرے پر ہر بار آنکھوں  
 میں آنسو آ جانا خود یہ بتاتا ہے کہ قلب رسولؐ ہر حال میں ہر  
 دور میں قلب رسالت ہی تھا قلب محمدؐ نہ تھا۔ بشریت کے عام  
 تقاضوں سے یہ دل بھی متاثر نہ ہوتا تھا۔ وقت کا مرہم رسولؐ اللہؐ  
 کے دل سے جناب خدیجہؓ کی جدائی کے زخم کو کبھی نہ مند مل کر مکا  
 پھر کیے پر باد کیا جاسکتا ہے کہ انھیں کی دو لڑکیوں کے ساتھ  
 رسولؐ کا سلوک کچھ ہے اور ایک لڑکی کے ساتھ رسولؐ کا سلوک  
 کچھ ہے۔ پس امتیازی سلوک پر ان لڑکیوں میں سے کبھی کسی نے کوئی  
 شکایت نہ کی۔ ایک صاحبزادی جناب بدر کے بعد و منات



پایا جاتی ہیں لیکن دوسری صاف جزادی تو جناب عثمان کے ساتھ برابر  
 رہیں۔ وہ جن حالات میں مکہ سے تشریف لائی ہیں۔ ان کے کافر  
 شہر نے ان کو جو اذیتیں پہنچائی تھیں اس کے بعد وہ مزید کرم  
 کی مستحق تھیں۔ لوگوں نے اپنا رجموں کی بارش ان کے ساتھ کی  
 لیکن ان کو وہ درجہ نہیں دیا جو جناب سیدہ کے لئے مخصوص کر دیا  
 گیا تھا۔ میں یہ تسلیم کر سکتا ہوں کہ جناب سیدہ بجنہلے مہی کی  
 اہل ہیں اور دوسری انہوں کی اہل نہ تھیں لیکن اذیت کا  
 مسئلہ تو ایسا تھا جو جسم کے لئے محفوظ ہے اور ان کا احساس بشریت  
 کے عام تقاضوں سے مطلق ہے۔ کم از کم ان بیٹیوں کی اذیت کو  
 اپنی اذیت قرار دیا ہوتا۔ غلام میں بجنہلے مہی کا بھی عام تصور  
 جسم ہی سے محفوظ ہے۔ اور وہ لوگ جو رسالت اور بشریت کو حیات  
 رسالت میں علیحدہ علیحدہ دیکھنے کے عادی ہیں ان کو اس حدیث  
 کے الفاظ کو بشریت کے عام تقاضوں کی روشنی میں دیکھنا چاہیے  
 اور اس میں رسول کو تقاضا بشریت کے ماتحت اپنی سب لڑکیوں  
 کو شریک کرنا چاہیے تھا لیکن رسول کا اپنی دیوانوں لڑکیوں کو  
 ہمیشہ نظر انداز کرنا اور جناب سیدہ کا ذکر بار بار کرنا اس بات کا  
 واضح ثبوت ہے کہ رسول کی عزت ایک ہی جگہ تھی اور وہ ہیں  
 جناب سیدہ صلوٰۃ اللہ وسلم علیہما۔ اور جو کچھ بھی آپ نے احادیث  
 میں ارشاد فرمایا ہے وہ سب رسالت کے تقاضوں کی انجام دہی  
 ہے۔ ایک باب اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ رہا ہے بلکہ



ختم الانبیاء اپنے فریضہ ہدایت کے سلسلہ میں جناب سیدہ کی عظمت سے دنیا کو روشناس کر رہے ہیں اور بجنۃ یعنی کہہ کر دنیا والوں سے یہ کہہ رہے ہیں کہ سیدہ شریک کا دو سالت ہیں اور عورتوں کو ہدایت کی تکمیل کے لئے سیدہ کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہے اور بخیر اس اتباع کے صحیح معنی میں ہدایت یافتہ ہونے کا تصور ایک ایسا خواب ہے جو بھی شر مندہ بخیر نہ ہو گا۔ خواہ وہ خاتون بخیال خود کتنی ہی عظیم منزلت پر کیوں نہ فائز ہوں۔

دوسری بات جو اس حدیث سے واضح ہوتی ہے۔ وہ مسلمانوں کے ان عام جذبات التزام کے بظاہر بالکل منافی معلوم ہوتی ہے جو ان کے دلوں میں جناب سیدہ کے لئے ہونے چاہئیں۔ یعنی ارشاد رسالت یہ ہے کہ ”سیدہ میرا جزو حصہ ہے جس نے اس کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی“

اس حدیث میں جناب سیدہ کی اذیت ہو بچانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حدیث مدینہ میں بیان فرمائی گئی۔ جب مدینہ مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں بدر دہشت کے قادی بکھی کھتے ہمارے و انصار کبھی کھتے۔ رسول کے جاں نثار بھی کھتے اور ادلا و رسول کے پرستار بھی کھتے۔ کون مسلمان یہ کہہ سکتا تھا کہ اسے سیدہ عالمیہ سے فحشیت و الفت نہیں ہے۔ خالص طریقہ سے وہ صحابہ جو رسول سے بہت قریب کھتے ان کے دل میں جناب فاطمہ کی بھی عزت بے حد لہجہ ہوگی۔ اس حدیث میں کفار و مشرکین کی جانب سے اذیت کا



کوئی اشارہ بھی نہیں ممکن ہے اس لئے کہ ان کی طرف سے دی گئی اذیت رسول کی اذیت کیسے ہو سکتی ہے بعض احادیث سے واضح اشارے اس بات کے بھی ملتے ہیں کہ جناب سیدہ کے بارے میں ارشادِ راسخ یہ بھی تھا کہ تم میرے بعد مجھ سے بہت جلد ملاقات کرو گی۔ اس روایت کی راوی بھی جناب عائشہ ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ علم رسالت میں یہ بات بھی تھی کہ حیاتِ سیدہ رسول کے بعد مختصر ہو گی اور پھر اپنی اسی ایک لڑکی کے بارے میں رسول کو "اذیت" کا احساس کیوں تھا؟ وہ کیوں مسلمانوں کو تنبیہ کرنا چاہتے تھے کہ اسے یاد رکھنا کہ سیدہ کی اذیت میری اذیت ہے۔ مسلمانوں کا نقطہ نظر جناب سیدہ کے بارے میں الفت و محبت کا ہونا چاہیے لیکن رسول اذیت کا تصور پیش کر رہے ہیں۔ اتنی ساری احادیث جناب سیدہ کے بارے میں رسول اکرم مسلمانوں کے مجمع میں پیش کر چکے ہیں ان کی بے مبالغہ محبت کے مظاہرے مسلمانوں کے سامنے کی بات ہے۔ آخر یہ رسول اکرم کو احساس کیوں ہے کہ سیدہ کو میرے بعد اذیت ہو گی۔ اور اگر احساس نہیں ہے تو اس غیر ضروری بات کے ارشاد فرمانے کی کیا وجہ ہے۔ ان دو باتوں میں کسی ایک بات کا جواب دینا عام مسلمانوں کے لیے دشوار ہے۔ اس ارشاد رسالت کے بعد جناب سیدہ کا قول بھی نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ آپ کا وہ شعر جو آپ نے بعد رسول ارشاد فرمایا تھا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "بابا آپ کے بعد میرے اوپر وہ مصیبتیں پڑیں جو اگر روزِ روشن پر پڑتیں تو وہ مثلِ شبِ ہائے تار کے ہو جاتے" یہ شعر



قول رسالت کی تصدیق کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اذیت بعد رسول جناب  
 سیدہ کو مسلمانوں کے ہاتھوں پہنچی تھی۔ قطع نظر اس کے کہ وہ مسلمان  
 کس منزلت کے حامل تھے۔ اب فرمان رسالت حدیث کی شکل  
 میں اور ارشاد جناب سیدہ دونوں کو ملا دیکھئے تو نتیجہ یہ صریح نکلتا ہے  
 کہ بعد رسول اکابر صحابہ اور اہلبیت رسول کے اختلافات اس منزل  
 تک تھے کہ وہ جناب سیدہ کی تکلیف کا سبب بنے اور جناب سیدہ  
 کی تکلیف رسول کی تکلیف کا سبب بنی۔ اس لئے ہر حال میں جناب  
 سیدہ حق پر کھڑی اس لئے کہ خلافت حق ہونے پر اگر جناب سیدہ  
 کو اذیت دی گئی ہوتی تو وہ جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف کا سبب  
 نہ بنتی۔ اور جناب رسول خدا اپنی حیات مقدسہ میں حدیث مذکور کو  
 بیان فرما کر سیدہ کے کردار کی وضاحت بھی کر رہے تھے اور مسلمانوں کو  
 متنبہ بھی کر رہے تھے کہ تم میرے بعد ایسی کوئی بات نہ کرنا جو میری  
 تکلیف کا سبب بنے۔ اب تاریخ خواہ جناب سیدہ کی اذیت کی داستان  
 بیان کرے یا نہ کرے۔ یا مسلمانوں کے عقائد و نظریات صحابہ و  
 اہلبیت کے باہمی تعلقات کے بارے میں کچھ بھی ہوں لیکن فرمان  
 رسالت تاریخ کی بھی اصلاح کر رہا ہے اور مسلمانوں کے نظریات  
 و عقائد کی بھی۔ اس لئے کہ اذیت کا وجود زبان رسالت سے اور  
 جناب سیدہ کے قول سے ثابت ہے۔ خود جناب سیدہ کے مرثیہ کا  
 شعر بھی یہی بتاتا ہے کہ جناب سیدہ صرف اپنی کیفیت غم کو عام طور



سے نہیں بیان کر رہی ہیں بلکہ اس اذیت کو اپنے عالی مرتبت باپ سے بطور شکوہ بیان کر رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے خود جناب سیدہ کے کبھی پیش نظر یہ حدیث رسولؐ ہے کہ "جس نے سیدہ کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی" مذکورہ بالا تفصیل کو اگر فحبل طور پر بیان کیا جائے تو حسب ذیل نتائج واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔

۱۔ سرور عالم کے صرف ایک صاحبزادی جناب سیدہ فاطمہؓ ہیں جو حضرت علیؓ کی شریک حیات اور جناب حسینؓ کی مادر گرامی تھیں۔ دوسری لڑکیاں جو مورخین نے درج کی ہیں وہ آپ کی پردہ پوش تھیں۔ محققین کسی غلط فہمی کی بنیاد پر یا عمداً جناب سیدہ کی فضیلت میں اور حضرت علیؓ کے فضائل میں مساوات اور انوکھیت پیدا کرنے کے لئے مورخین نے دختران رسولؐ لکھا ہے اور یہی موقف اسلام کے ایک اہم فرقہ کا بھی ہے۔ وہ رسولؐ کی حسرت ایک ہی بیٹی کو تسلیم کرتا ہے غل رسالت بھی اور قول رسولؐ بھی حسرت ایک ہی بیٹی کی نشان دہی کرتا ہے۔

۲۔ جناب سیدہ (جو بلا کسی) اختلاط کے دختر رسولؐ ہیں) کے بارے میں سرور عالم کو یہ احساس تھا کہ ان کے بعد انکی بیٹی کو مسلمانوں کے ہاں کھول اذیت اور تکلیف پہنچے گی اور یہ اذیت اور تکلیف ناحق پہنچائی جائے گی سیدہ حق پر ہوئی۔ اسی لئے



سیدہ کی اذیت کو رسولؐ نے اپنی اذیت کو محسوس کیا ہے۔

۳۔ جناب سیدہؓ کو بصدوحۃ میں کہہ کر رسولؐ نے دنیا کی عورتوں کے سامنے یہ بات واضح کر دی تھی کہ سیدہؓ شریک کا رسالت ہیں اور دنیا کی تمام عورتوں کو جناب سیدہؓ کی تقلید کرنی چاہیے خواہ کسی مرتبہ کی کیوں نہ ہوں۔

۴۔ جناب سیدہؓ کو جنت کی عورتوں کی سردار بتا کر سرور عالمؐ نے اصطلاحی اور عملی حیثیت سے معصومہؓ قرار دیا ہے اس لیے کہ جنت میں جناب مریمؑ بھی ہوں گی جناب سادہؑ و خوارؑ بھی ہوں گی چونکہ حدیث رسولؐ میں کوئی استثناء نہیں ہے اس لیے یقیناً جناب سیدہؓ تمام خواتین کی سردار ہوں گی اور اسی صورت میں دنیا کی غیر معصومہ عورت جنت میں معصومہ عورتوں کی سردار ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر یہ کہ جنت میں مراتب دنیا کے عمل کے نتیجہ میں ہونگے۔ جنت کی سرداری خواہ کسی کو ملے وہ اپنے اعمال کے لحاظ سے ان تمام جنت والوں سے بہتر کا وہ سردار ہو گا بہر حال افضل ہو گا۔ اسی لیے جناب حسنینؑ کو جب جو انہا جنت کا سردار بتایا تھا تو اسی حدیث میں استثناء کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ "حسن و حسینؑ جو انان اہل جنت کے سردار ہیں اور ان کے باپ ان سے افضل ہیں" جو اس شرف کو عطا کر رہا ہے یعنی خود رسولؐ اکرمؐ وہ سب سے افضل علیؑ کا استثناء ہو چکا ہے۔ ماں جنت کی خواتین کی سردار ہے اس لیے عقل کا تقاضہ یہی ہے کہ ان شخصیتوں کے بعد حسنینؑ کو سب سے افضل مانو خواہ انبیاء ہوں یا اوصیاء یا کوئی



اور در نہ اگر علیؑ کے سوا کوئی استثناء ضروری ہوتا تو رسولؐ خود اس ذات کو یا اس طبقہ کو یا اس سلسلہ و شد و ہدایت کو مستثنیٰ فرما دیتے۔ اسی طرح جناب سیدہؑ کی سرداری کے بارے میں بھی کوئی استثنیٰ نہیں ہے۔ حسنینؑ کے بارے میں بھی کوئی استثنیٰ نہیں ہے۔ اس لئے یہ ذات مقدسہ رسولؐ و علیؑ کے بعد سب سے افضل ہوں گے اور اسی جو اتان اہل جنت کی حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ جناب حسنین علیہم السلام بلا کسی شک و شبہہ کے معصوم ہیں اس لئے کہ انبیاء کرام تمام مسلمانوں کے لفظ نظر سے بلا کسی اختلاف کے معصوم ہیں اور جناب حسنینؑ کی جنت کی سرداری سب پر مسلم ہے اس لئے معصوم افراد کا سردار غیر معصوم کیسے ہو گا۔

## دوسری حدیث

ارشاد حضرت سرور عالم کہ "سلمان اہم اہلبیت میں سے ہیں" عجم کے رہنے والے مسلمان جو سلمان فارسی کہلاتے تھے۔ ان کو اہل بیتؑ کے زمرہ میں شامل کیا گیا اور وہ سلمان محمدی کہلاتے لگے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ اعلان کہ یہ سلمان اہم اہلبیتؑ میں سے ہیں "پورے سلسلہ و شد و ہدایت کی تاریخ میں ایک اہم بات کی نشان دہی کرتا ہے اور یہ حوالہ مستحقین کرتا ہے کہ اسلام نے سب سے زیادہ زور کر دار انسانی پر دیا ہے اگر کردار نہیں تو کچھ بھی نہیں



بالخصوص پیغمبر سے قربت حاصل کرنے کے لئے اور پیغمبر کی محبت حاصل کرنے کے لئے حضرت کردار کی ضرورت ہے اس اصول کے دو رخ ہیں دونوں کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ کرنا ہے تاکہ بات واضح ہو جائے۔

۱۔ رشتے اور عزیز واریاں بغیر کردار کے بارگاہ نبوت میں قربت کا ذریعہ نہیں بن سکتی ہیں۔ اور نہ نجات کا ضامن ہو سکتی ہیں۔

۲۔ کردار کی بلندی اور عظمت بغیر سابقہ قرابت داری کے بھی قربت پیغمبر کا سبب بن سکتی ہے اور نجات کی ضامن ہو سکتی ہے۔

اب سلمان قرابت پیغمبر پر جتنا بھٹی چاہے زور دے اور جو عقیدہ بھی رکھے لیکن یہ حدیث بغیر کردار و صورت ظاہری قرابت پیغمبر کی بنا پر عظمت و تقدس کے لائق و عقیدہ کی نفی کرتی رہے گی اور اس کو باطل قرار دیا جائے گی۔

۱۔ ابتداء خلقت کے بعد ہی انسان گمراہی میں مبتلا ہو چکا تھا اور بنیاض فطرت بشر نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اب ان افراد کو طوفان میں غرق کئے جانے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہا۔ اسی لئے عذاب کی استدعا کی گئی اور وہ عذاب طوفان نوح کی شکل میں آیا۔ جناب نوح اپنے ساتھ بہت کھوڑے سے ہدایت یافتہ افراد کو لے کر کشتی میں سوار ہو گئے لیکن خود ان کا فرزند ان کے ساتھ کشتی میں سوار نہیں ہوتا اور کشتی کے بجائے پہاڑ کو زیادہ محفوظ



سمجھتا ہے۔ جناب نوحؑ یار گاہ ایزدی میں عرض کرتے ہیں کہ یہ میرے  
 اہل میں سے ہے (لہذا امن و امان) کوئی کم فہم یہ سمجھ سکتا ہے کہ  
 جناب نوحؑ معاذ اللہ مجتہد اولاد میں گرفتار تھے لیکن جناب  
 نوحؑ پوری دنیا کو جسے اب طوفان کے بعد از سر نو آباد ہونا ہے  
 یہ بتا دینا چاہتے تھے اور ہمیشہ کے لئے اس اصول کو مستغین کر دینا  
 چاہتے تھے کہ اہلبیت پیغمبر کا معیار صلب نہیں بلکہ کردار ہے۔  
 اسی لئے شاید جناب نوحؑ نے اپنی (یعنی میرا فرزند) کی لفظ نہیں  
 صرف فرمائی بلکہ اہل کی لفظ صرف فرمائی۔ بیٹے کو بچا نا تھا لیکن  
 معیار اہلبیت کا مقرر کیا جا رہا تھا۔ نفا میں آواز ضمیر کی بلند ہوئی  
 اور خالق کا جواب بھی سنائی دیا "لیس من اھلک انہ عمل  
 عنہ صالح" یہ آپ کے اہل سے نہیں ہے اس لئے کہ یہ عمل غیر صالح  
 رکھتا ہے۔ خالق کا جواب بھی صاف تھا یہ نہیں کہا کہ یہ آپ کے صلب  
 سے نہیں ہے بلکہ یہ ارشاد ہوا کہ آپ کے اہل سے نہیں ہے۔ چونکہ  
 عمل غیر صالح کا حامل ہے۔ اور اسی وقت قیامت تک کے لیے یہ اصول  
 طے پا گیا کہ اہلبیت پیغمبر ہونے کے لئے عظمت کردار کی ضرورت ہے  
 اور اس پورے واقعہ کو تفصیل سے قرآن میں اس لئے بیان کر دیا گیا  
 کہ قیامت تک باقی رہنے والی کتاب کے ذریعہ بطور سند اسے  
 پیش کیا جاسکے۔

یہ امر خالص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پسر نوحؑ کے لئے



قرآن مجید نے جو لفظ صرت کی ہے وہ اس کے جراح اور اعمال کے پیش نظر بہت ہلکی لفظ ہے۔ وہ نبوت کا قائل نہ تھا اس لئے وہ یقیناً وحدت کا بھی قائل نہ رہا ہو گا۔ اسے نبوت سے انکار کے جرم میں عرق کر دیا گیا تو کیا اسے عمل غیر صالح کی لفظ کے بجائے کافر یا مشرک نہیں کہا جاسکتا تھا۔ لیکن قرآن میں صرت عمل غیر صالح کی لفظ صرت ہوئی ہے جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اصل میں شاید اس کے عمل کی شدت کا بیان مقصود باری نہیں ہے بلکہ اہلبیت پیغمبر کے معیار عمل کی نزاکت کو بیان کیا جا رہا ہے۔ اگر جناب نوح کے سوال کے جواب میں ارشاد خالق یہ ہوتا کہ یہ آپ کے اہل سے نہیں ہے اس لئے کہ کافر ہے یا منافق ہے یا مشرک ہے تو بہت خوب۔ اہلبیت پیغمبر کے معیار عمل سے علیحدہ کرنے کے لئے شرک کفر اور نفاق حد فاصل بنتے صرت عمل غیر صالح نہ ہوتا۔ اب کفر و نفاق کے بجائے کوئی بھی عمل غیر صالح اہلبیت رسول کے زمرہ سے علیحدہ کر دینے کے لئے کافی ہے اور یہ معیار قرآن میں بیان ہوا ہے۔ اس کا مطلب واضح طور سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ذات جو اہلبیت پیغمبر کے زمرہ میں شامل ہیں وہ خواہ اصطلاحی طور پر معصوم نہ ہوں لیکن عملی طور پر ان کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ ورنہ وہ عمل غیر صالح کی زد میں آجائیں گے۔ خواہ وہ نسل پیغمبر سے کیوں نہ ہوں۔ یہ تھا وہ معیار جو بالکل ابتدائے انسانیت کے دور میں اہلبیت پیغمبر کے بارے میں طے پا گیا تھا۔ لیکن اس سے تصور کا صرت ایک رخ واضح طور پر نمایاں ہوا تھا۔ وہ یہ کہ اگر قرابت داران پیغمبر میں کوئی شخص عمل غیر صالح



رکھتا ہے تو خواہ وہ اولاد پیغمبر ہی کیوں نہ ہو اہلبیت پیغمبر کے زمرہ میں شمار نہ ہوگا۔

۲۔ لیکن اس اصول کا دوسرا رخ یعنی کردار کی بلندی بغیر کسی سابقہ قرابت داری کے بھی قربت پیغمبر کا سبب بن سکتی ہے یا نہیں اس کی کوئی مثال فرد کی شکل میں سامنے نہیں آتی کھٹی اور رقتویہ کا یہ رخ اب ارشاد حضرت ختم الانبیاء کے بعد مکمل ہو گیا کہ "سلمان ہم اہلبیت میں سے ہیں" اس ارشاد نبوی نے یہ بتا دیا کہ اہلبیت پیغمبر ہونے کے لئے قرابت داری اور رشتہ ضروری نہیں ہے بلکہ اصل شے کردار ہے۔ فارس کا رہنے والا سلمان بھی اہلبیت پیغمبر میں شامل کیا جاسکتا ہے اگر وہ غیظم کردار کا حامل ہو اور عمل صالح رکھتا ہو۔ رقتویہ کا ایک رخ استدرائے انسانیت میں سامنے آیا اسکی اور بھی مثالیں وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہیں۔ قابیل کا واقعہ پسر نوح کے قبل کا ہے اس لئے پہلے اس کا تذکرہ ہونا چاہیئے نہ کہ بعد میں۔ چنانچہ برادران یوسف بھی اسی معیار کی نمائندگی کرتے رہے جو پسر نوح کا متعین ہو چکا تھا۔ اور قرآن ہر ایک کے واقعہ کو تفصیل سے بیان کرتا رہا تاکہ آنے والی دنیا اس سے سبق لے سکے۔ لیکن مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جناب سلمان کے قبل پوری تاریخ پر مشدد ہدایات میں کوئی غیر اپنے کردار کے ساتھ اس طرح نمایاں نہ ہوا تھا کہ اسے کوئی نبی یا رسول اپنے اہلبیت میں شامل کرنا۔ آخری مرحلہ نبوت میں جناب سلمان آئے اور انھوں نے زبان پیغمبر سے اپنے



بارے میں مذکورہ حدیث کی سند لے کر تقویر کے دوسرے رخ کو کھل  
 کیا۔ اور ہمیشہ کے لئے یہ اعلان ہو گیا کہ اہلبیتؑ یا غیر ہونے  
 کے لئے صرف کردار کی ضرورت ہے خواہ یہ اپنوں میں ہو یا غیر  
 میں خواہ ملکی میں ہو یا غیر ملکی میں۔ خواہ قریش میں ہو یا غیر  
 قریش میں۔

سرور عالمؐ کی یہ حدیث مسلمانوں کے عقائد اور نظریات کی  
 بھی اصلاح کر رہی ہے۔ جناب سلمان صحابی ہیں اور جو بھی انہیں راست  
 میں آکر شامل ہوا وہ صحابی رسولؐ کے مشرک سے مشرف ہوا۔  
 جنگ احد کے موقع پر جب خندق تیار کی جا رہی تھی تو ایک صحابی  
 خندق کو دوتا کھتا دوسرا مٹی اکٹھا کر باہر ڈالتا تھا اس طرح دو  
 آدمیوں پر یہ قبحہ تقسیم کر دیا گیا۔ انصار نے انصار کو اپنا سا کھنٹی بنایا  
 ہاجر نے ہاجر کو۔ خود سرور عالمؐ کے ساتھ حضرت علیؑ تھے  
 جناب سلمان نے دونوں کام خود سنبھال لئے۔ خود ہی خندق  
 کھودتے اور خود ہی مٹی پھینکتے تھے اور کھنٹیوں نے اس کام کو اس  
 خلوص سے انجام دیا کہ ہر ایک نے جناب سلمانؓ کو اپنا ناشروع کیا۔  
 ہاجر نے یہ کہہ کر جناب سلمانؓ کو اپنا بنانے کی کوشش کی کہ چونکہ وہ  
 مدینہ کے ساکن ہیں اس لئے ہاجر ہیں اور جب ہاجر ہیں تو  
 ہم میں سے ہیں۔ انصار نے ہاجر کے خلاف یہ نکتہ پیدا کیا کہ  
 چونکہ ہاجر سب کے سب مکہ کے ہیں اور سلمان مکہ کے رہنے والے



نہیں ہیں اس لئے "سلمانؓ ہم میں سے ہیں" یہ مسئلہ ہادی عالم  
 تک پہنچا اور انھوں نے یہ ارشاد فرمایا کہ "سلمانؓ ہم اہلبیتؑ  
 میں سے ہیں" اس پورے پس منظر پر نگاہ ڈالنے اور اس کے بعد  
 جناب سلمانؓ کی منزلت پر غور کیجئے صحابی سب تھے خواہ انصار  
 ہوں یا مہاجر۔ ہر ایک جناب سلمانؓ کو اپنے میں شامل کر رہا تھا  
 رسولؐ نے دونوں گرد ہوں سے علیحدہ کر کے اپنے اہلبیتؑ میں  
 شامل کر لیا۔ اب کون ہے جو اس بات سے انکار کرے گا کہ جناب  
 سلمانؓ کے شرف میں اضافہ نہیں ہوا۔ مہاجر و انصار جناب سلمانؓ  
 کو اپنے ساتھ رکھ کر اپنے شرف میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ رسولؐ  
 نے سلمانؓ کو اپنے ساتھ کہہ کر جناب سلمانؓ کے شرف میں اضافہ  
 کر دیا اور ان کی منزلت کو بڑھا دیا اور اس طرح ہمیشہ کے لئے  
 یہ فیصلہ کر دیا کہ صحابی حبیب ترقی کرتا ہے جب اس کی منزلت میں اضافہ  
 ہوتا ہے تب وہ اہلبیتؑ سے قریب ہوتا ہے یعنی صحابیت کی  
 منزل اہلبیتؑ کے درجہ سے بہت ہے۔ کوئی بھی صحابی ہو کسی  
 منزل کا کیوں نہ ہو وہ باعتبار شرف اہلبیتؑ سے بہت ہی ہو گا۔  
 اس طرح مسلمانوں نے خلافت کو جو شرف دیا ہے اور فضیلت باعتبار  
 خلافت کا جو معیار قائم کیا ہے وہ جناب سلمانؓ کے بارے میں  
 اس حدیث کے ارشاد فرمانے کے بعد ہمیشہ کے لئے رد ہو جاتا ہے  
 واقعہ کا ہر پہلو ہی بتاتا ہے کہ جب صحابہ انھیں اپنا نا چاہتے تھے



خواہ ہاجر ہوں یا انصار تو رسول اکرمؐ نے ان کے مشرف میں اضافہ کر کے ان کو اپنا بتایا اور وہ بھی ایسے وقت میں جب وہ باعتبار کردار و عمل ہر صحابی سے بلند و برتر ہو چکے تھے تب ان کو مشرف اہلبیتؑ کا مشرف ملا۔ اس لئے اب اہلبیتؑ کے مقابلہ میں صحابہ کے مشرف کا تصور عصبیت تو ہو سکتا ہے حقیقت نہیں بن سکتا۔

## تیسری حدیث

ارشاد حضرت سرور عالمؐ کہ ”میرے ازواج میں ایک کے اور پر مقام حواؑب میں کتے بھونکیں گے اور اس دن وہ باطل پر ہوگی۔“

## چوتھی حدیث

ہادی عالم جناب رسول خداؐ نے اپنے صحابی جناب زبیرؓ کو مخاطب کر کے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ”تم ایک دن علیؑ سے جنگ کر دے اور اس دن تم باطل پر ہو گے۔“

## پانچویں حدیث

رہبر انسانیت جناب ختم الانبیاءؐ نے اپنے بزرگ مرتبہ صحابی جناب عمارؓ کو مخاطب کر کے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اے عمارؓ ”تم کو گروہ باغی قتل کرے گا تم ان کو جنت کی طرف بلاتے ہو گے اور



وہ تم کو دوزخ کی طرف بلانے ہوں گے۔

یہ تین سٹیمپ دو جنگوں کے بارے میں ارشاد ہوئی ہیں۔  
اور ان تینوں جنگوں کے بارے میں مسلمانوں میں آج تک  
اختلاف رائے ہے۔ اور شاید قیامت تک یہ اختلاف رہے گا۔

اسلام کا ایک فرقہ ان تمام محرکوں میں حضرت علیؓ کو ہر حال میں  
حق پر سمجھتا ہے اور ان کے مخالفین کو باطل پر سمجھتا ہے۔

دوسرا فرقہ یہ رائے رکھتا ہے کہ بلا سببہ ان تمام جنگوں میں  
حضرت علیؓ حق پر تھے لیکن ان کے مخالفین سے اس جنگوں میں  
خطا، اجتہاد کی سرزد ہوئی تھی اس لئے وہ اس غلطی کے باوجود موجر  
اجر و ثواب ہوں گے اس طرح قاتل و مقتول کم و بیش دونوں ایک  
ہی منزل میں ہوں گے۔

تیسرا انتہا پسند طبقہ وہ ہے (اگرچہ یہ لوگ زیادہ نہیں ہیں)  
جو ان تینوں جنگوں میں حضرت علیؓ کے مخالفین کو شاید حق پر  
سمجھتا ہے اور ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان لوگوں نے حضرت  
علیؓ سے جنگ کر کے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

یہ مسلمانوں کے تین طبقہ خیال کے لوگ آج تک باقی ہیں  
اور جب یہ محرکے ہوئے تھے اس کے بعد ہی اسے زبان و قلم کے  
سحر کے آج تک جاری کیا۔

آئیے اس سلسلہ میں عقل و نقل کی روشنی میں یہ دیکھیں کہ



مسلمانوں کے نقطہ نظر سے ہرٹ کر خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم  
کا ان تینوں جنگوں کے بارے میں کیا نقطہ نظر ہے اور ان کی  
کیا رائے ہے۔ اور وہ ان تینوں گروہوں میں سے کس گروہ کی  
تائید فرماتے ہیں اور جو رائے رسول اکرم کی ہوگی وہی حق ہوگی  
اور باقی تمام رائیں باطل ہوں گی۔

ان تینوں جنگوں میں حالات کی بڑھتی ہوئی کیفیتیں  
دونوں طرف بزم رسالت کے سمجھنے والے اصحاب ایک دوسرے  
کے سامنے فریق مخالف کی حیثیت سے نمایاں ہوئے اور  
عام مسلمانوں کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ حق کدھر ہے  
اور باطل کدھر۔ جنگ جمل میں ایک طرف کا شائبہ نبوت میں  
رہنے والی توجہ رسول کھینچ کر عام المومنین کے لقمہ سے  
ملقب کھینچ کر تو دوسری طرف برادر رسول اور دایا در رسول کھینچ  
اس طرح صحابہ بھی دو طبقوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے۔ اس وقت  
جو شخص بھی نیک نیتی سے تلاش حق کرنا چاہتا ہے اس کے  
ذہن کو سہارا دینے کی ضرورت ہے اور یہ سہارا صرف رسول  
کی ذات ہی دے سکتی ہے اور وہی فیصلہ کن ہو سکتی ہے۔  
اگر نگاہ غائر سے دیکھا جائے تو جنگ جمل و صفین

نہروان کے بارے میں احادیث رسول اتنے واضح اور سہل  
نمایاں ہیں کہ اتنے نمایاں اور واضح احادیث صلح امام حسن اور



جنگ کربلا کے بارے میں نہیں ہیں۔

یعنی واقعات کربلا میں شریک دونوں فریقوں میں سے کسی ایک سے بھی رسول اللہ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ تم حسینؑ کے موافق یا مخالف جنگ کرو گے اور اس دن تم حق پر ہو گے یا باطل پر ہو گے۔ یا اسی طرح کے موضوع سے ملتی جلتی کوئی حدیث کلمہ از کلمہ سیری نگاہ سے نہیں گذری۔ میرا مطالعہ اس طرح کی حدیثوں کے بارے میں نہ ہونے کے برابر ہے میں نے کسی سے سنا نہ کہیں دیکھا۔ لیکن جنگ جمل صفین و نہر دوان کے شرکاء کے بارے میں واضح احادیث اور اعلانات موجود ہیں۔ ہادی عالم نے کوئی ایک موقع پر بھی نظر انداز نہیں کیا جہاں تبلیغ کے ذرائع نہ ادا کئے ہوں۔ یہ واضح احادیث بلا کسی اختلاف کے ہر فرقہ کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ آخر اس کا کیا بار انداز ہے۔ حضرت امام حسنؑ و امام حسینؑ کے بارے میں ولادت کے بعد ہی سے سردِ عالم کے گریہ کی روایات تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ واقعہ کربلا میں ہونے والے مظالم کو رسول خداؐ گویا حال کے آئینہ میں بہ نفس نفیس ملاحظہ فرما رہے تھے لیکن اس کے باوجود واقعہ کربلا کے بارے میں اتنی واضح احادیث نہیں ملتی ہیں جتنی جمل و صفین کے بارے میں ملتی ہیں۔ یقیناً رسول خداؐ یہ جانتے تھے کہ جمل کا معرکہ وہ پہلا مرحلہ ہو گا جب مسلمانوں کے



اختلافات اتنے زیادہ ہو جائیں گے کہ ان کی اکثریت تلوار لے کر  
 ایک دوسرے کے مد مقابل ہو جائے گی، اور حمل ہی کی جنگ سے  
 صیفین کے لئے راہ ہموار کر لی جائے گی۔ اور یہ سب کچھ حق کے  
 نام پر کیا جائے گا، اور ایسی سختیتیں میدان میں ہوں گی کہ عام  
 مسلمانوں کو یہ دھوکہ ہو گا کہ حق کدھر ہے باطل کدھر ہے اس لئے  
 رسول خدا و صلیح احادیث کے ذریعہ مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ ادا  
 کر دینا چاہتے تھے اور انھوں نے ایسا کر دیا۔ سرور عالم ام المومنین  
 عائشہ کے مزاج سے بھی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ام المومنین  
 کو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہ جاتا ہے۔ ام المومنین صفیہ کے چینی کے  
 پیالے کو انھوں نے محض اس لئے چکنا چور کر دیا تھا کہ ان کی باری  
 کے دن میں حضرت صفیہ نے کوئی چیز کیوں رسول کے لئے رکھا کر دیا  
 کی۔ ام المومنین حضرت خدیجہ کو جب سرور عالم نے ام المومنین عائشہ  
 کے سامنے یاد کیا، حالانکہ یہ یاد ان کی وفات کے بعد تھی پھر بھی ام المومنین  
 عائشہ اپنی ناراضگی کے اظہار میں ذرا بھی تکلف سے کام نہ لے سکیں۔ اگرچہ  
 رسول خدا کو ان کے اس اعتراض پر ہمیشہ تکلیف ہوتی تھی۔ واقعہ تحریم  
 ام المومنین مار یہ قبیلہ کے ساتھ انھیں کی بدسلوکی کی بنیاد پر عالم وجود  
 میں آیا تھا۔ اسی لئے رسول اکرم تمام حجت کے ہر فریضہ کو ادا  
 کر دینا چاہتے تھے۔



ام المومنین عائشہ کی بد نصیبی یہ تھی کہ قدرت نے انھیں دولت  
 اولاد سے محروم کر دیا تھا۔ یہ محرومی بہت سے ازدواج کا مقدر بنی  
 تھی۔ لیکن ہر ایک کے احساسات مختلف ہوتے ہیں۔ کچھ ازدواج  
 رسول جیسی نعمت پا کر اپنے ماضی و حال مستقبل سے بے فکر ہو کر  
 رہ گئیں۔ انھوں نے شاید یہ سوچا ہو کہ اب اور ک کیا بانی رہ گیا۔  
 لیکن ام المومنین عائشہ شاید اپنے مستقبل کے احساسات سے  
 بے نیاز نہ رہ سکیں۔ دولت اولاد سے محرومی کے باعث انھوں نے  
 اسی مادی محبت کو اپنے بھائی عید الشہین زبیر میں منعم کر دیا  
 تھا۔ اور عید الشہین زبیر نے ام المومنین کی اس کرداری سے  
 بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔

پہلی خلافت کے موقع پر جب خلافت کو کردار کا تابع نہ بتایا  
 گیا بلکہ کردار کو تابع خلافت بنانے کی کوشش کی گئی۔ اسی وقت سے  
 بہت سے دلوں میں خلیفہ بننے کی تمنا بیدار ہو گئی تھی لیکن دوسری  
 خلافت کا زوال جس پس منظر میں ہوا اس کے نتیجے میں لوگ کردار کی  
 تلاش میں تھکے دروازے تک آئے۔ مولار کائنات کے خلیفہ  
 ہونے کے باعث بہت سے لوگوں کی تمنائیں خاک میں مل گئیں۔

عید الشہین زبیر کو یہ موقع غنیمت معلوم ہوا۔ انھوں نے سوچا ہوگا  
 کہ ان کی ماند مہربان زوجہ رسول ہیں۔ ام المومنین ہیں، مسلمانوں کے  
 پہلے خلیفہ کی دختر ہیں۔ بہت سے جاہ پرست صحابہ کی طاقت بھی  
 ان کے ساتھ ہے۔ ان کے مقابل علیؑ ہیں۔ جو ان کی سیت ام المومنین



حضرت خدیجہؓ کے داماد ہیں۔ علیؓ کی طاققت پچھلے چھبیس برسوں میں  
 کمزور بھی کی جا چکی ہے۔ علیؓ کی پشت پناہی ان کے کردار کے سوا کون  
 کرے گا۔ یہاں پوری دنیا اپنے ساتھ ہے۔ وہاں گرم ہو چکا ہے صرف  
 موڑنے کی ضرورت ہے اگر علیؓ کو اس جنگ میں شکست دی جا سکی  
 تو ظاہر ہے کہ ام المومنین خود خلیفہ نہ ہوں گی لیکن خلیفہ اگر ضرور ہونگی  
 اس طرح سے خلافت کا ہما زبیر کے سر پر منڈلائے گا۔ اور باپ کے  
 مرنے کے بعد یہ خلافت بلا شرکت غیرے مجھے مل جائے گی۔

عبداللہ بن زبیر کو خلیفہ ہونے کی بھید خواہش تھی اس خواہش  
 کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش انھیں جنگ جمل کے ذریعہ ملی۔ اس  
 خواہش کی انتہا واقعہ کربلا کے بعد ہوئی۔ انھوں نے اس موقع سے فائدہ  
 اٹھانے کی سعی کی جس سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔

ام المومنین عائشہؓ قتل حضرت عثمانؓ کا فتویٰ دے کر سب چلی گئی  
 تھیں اور وہ قتل بھی ہو گئے۔ اب حضرت علیؓ کے لئے تیاریاں کی جا رہی  
 تھیں۔ یہ کھتا وہ پس منظر جس میں ام المومنین حضرت عائشہؓ طوفان  
 کی طرح مگر مے اٹھیں، اور ہوش سے بے نیاز ہو کر جوش کے عالم میں  
 آنسو کی رفتار سے چلیں۔ مصر کا مال غنیمت کثرت لشکر اندھے  
 عقیدت مندوں کا، نجوم لے کر منزلیں مارتی ہوئی وہ آگے بڑھ رہی  
 تھیں اور آیت قرآنی "فقد صفت قلوبکم" کی علی تفسیر بنی  
 ہوئی تھیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا تاہم آگے بڑھ رہا تھا لیکن اس کے  
 باوجود مقام ہو آب پر کنڈوں کے بھونکنے کی آواز سے بے نیاز نہ رہ سکیں۔



آواز کا کانوں میں گونجنا تھا کہ عہد رسالت کا نقشہ ذہن میں پھر گیا  
 شاید وہ سماں یاد آ گیا ہو جب اہمات المؤمنین کے مجمع میں سرور  
 عالم ارشاد فرما رہے تھے کہ "میرے ازواج میں سے ایک پر مقام  
 ہو آج پر کتے کھونٹیں گے اور اس دن وہ باطل پر ہوگی۔ اور اے  
 حمیرا کہیں وہ تم نہ ہونا" اب کتوں کی آواز نے دماغ کے سارے  
 تار جھنجھٹا کے رکھ دیے ہوں گے۔ ہادی عالم کا یہ ارشاد یاد آ گیا  
 ہو گا۔ دلیل سے پوچھا یہ کون سی جگہ ہے اس نے تصدیق کر دی کہ یہ  
 مقام ہو آج ہے۔ بناؤ کی دہی کا حکم ہوا، اور اس کے بعد جھوٹی  
 گواہیاں دلائی گئیں کہ یہ ہو آج نہیں ہے۔ اور ام المؤمنین نے  
 اپنے ضمیر کے لئے اطمینان کا جھوٹا سہارا تلاش کر لیا۔ لیکن ہادی عالم  
 کی حدیث نے فریضہ تبلیغ ادا کر دیا۔ ابہام دور کر دیا۔ حق کو ہر شک  
 و شبہ سے بالا کر دیا۔ میدان حبل میں جناب زبیر کو حدیث رسول  
 خود مولائے کائنات نے یاد دلائی۔ زبیر نے بہت تاخیر کر دی تھی اور  
 ان کے ذریعہ سے جو لوگ گمراہ ہوئے وہ راست پر نہ آ سکے، لیکن  
 راستہ میں اور میدان جنگ میں ہر جگہ ابہام کے پردوں کو چاک  
 چاک کر دیا گیا۔ رسولؐ کو یا مسلمانوں کے شعور سے یہ کہہ رہے تھے  
 یہ موقع جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینے کا ہے۔ میں علیؑ کی حقانیت  
 کے بارے میں جو کچھ کہہ چکا ہوں وہ اگر تم بھول چکے ہو تو کم از کم  
 وہ تو یاد رکھو جو میں نے تمہارے بارے میں کہا ہے۔ اصل مسئلہ تمہاری  
 نجات کا ہے۔ تمہاری رہنمائی کے لئے میں موجود ہوں۔ مگر کون سنتا ہے۔



جو ہوتا تھا وہ ہو کر رہا۔

اب جنگ صفین کا مرحلہ ہے یہاں رسول اکرم نے ایک شخص کو لاکر میدان میں کھڑا کر دیا اور اسکی شہادت کو معاویہ حق و باطل قرار دیا۔ اسے عمار بن ابی سلمہ کو گردہ پانچ قتل کرے گا تم کو وہ روزخ کی دعوت دیتا ہو گا اور تم اسے جنت کی طرقت بلائے ہو گے! اس حدیث کے پہلے حصہ میں خاتمین جناب عمارؓ کو باغی قرار دیا گیا ہے دوسرے حصہ میں جناب عمارؓ کی دعوت کے حاصل کو بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ ہر طرح کا ابہام دور ہو جائے اور شک و شبہ کی فضا ختم ہو جائے۔ ہر ایک کا مشاہدہ اس شہادت کا میدان جنگ میں گواہ ہو گا۔ عمارؓ کی شہادت جنگ خود ہر ایک کو یہ بتا دیگی کہ حق کی ہوا کدھر سے چل رہی ہے۔

دفاعت رسول کے بعد حق و ناحق کے اختلافات لاکھوں میں دبی ہوئی چیز گاہی کے مانند تھکے لیکن اب وہ جنگاری شعلہ بن چکی تھی۔ مگر ہر موقع پر حدیث رسول حق کے تحفظ کے لئے موجود ہے۔ حدیث رسول مقام اہل آب پر گویا مسلمانوں کا اور ام المؤمنین کا راستہ زد کے کھڑی ہے۔ اور غیر مکلف مخلوق کے ذریعہ گویا قدرت یہ اعلان کر رہی ہے کہ بے عقل انسان اگر تم کو شہور نہیں تو ہم تم کو آگاہ کر دے ہیں کہ یہ راستہ باطل کا ہے۔ میدان جنگ میں حدیث نہ ہیر کے پیر کی بیٹری بن کر رہ گئی۔ صفین کا مرحلہ آیا تو صحابی رسول اپنی جان بھیلی پر دکھ کر میدان میں آگیا۔ دو جنگوں کا زمانہ بالکل



قریب قریب ہے۔ دو جنگوں کا مفقود بھی ایک ہی ظاہر کیا گیا ہے۔  
 یعنی جس نے محافطت کی کھتی اسی پرقتل کا جھوٹا الزام عائد کیا گیا  
 ہے۔ حالات کی بدفہمی یہ ہے کہ امیر المومنینؑ خود ایک فریق بنائے  
 گئے اس لئے اب ان کی کون سے گناہ لئے ہر ابہام کو دور کرنے  
 کے لئے حدیث رسولؐ موجود ہے۔ اب گویا سردار عالمؑ یہ ارشاد فرما رہے  
 ہیں کہ میں یہ کہتا ہوں کہ علیؑ کا مخالف گردہ باغی ہے اور دعوت  
 دوزخ دیتا ہے۔ عمارؓ شہید ہو گئے اور ان کی شہادت نے جھنجھوڑ کر  
 رکھ دیا۔ امیر شام کو تادل کرنا پڑی کہ کچھ نہ کچھ کہنا کھایا کہ دیا کہ  
 چونکہ "علیؑ لائے کھے اس لئے قاتل وہی ہیں ہم نہیں ہیں" مولانا  
 ابوالاعلیٰ مودودی نے اس کا جو جواب دیا ہے انھیں سے سنئے وہ یہ  
 فرماتے ہیں کہ "امیر شام کی تادل اس لئے غلط ہے کہ رسول خداؐ نے  
 یہ کہاں فرمایا تھا کہ اے عمارؓ تم کو گردہ باغی اسے ساتھ لائے گا  
 سردار عالمؑ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اے عمارؓ تم کو گردہ باغی قتل  
 کرے گا۔ قتل جس گردہ نے کیا وہ مصداق حدیث رسولؐ ہے۔  
 ابہام یہاں بھی دور کر دیا گیا۔ اب کوئی شک و شبہ نہ رہا۔ اب  
 ہردان کی منزل ہے۔ ہردان کی جنگ صفین کا شاخسانہ ہے  
 اگر صفین کی جنگ نہ ہوتی تو ہردان کا مرحلہ پیش آتا۔ یہاں  
 بھی ذوالشعبہ والی حدیث رسولؐ موجود ہے اس لئے کہ ابہام کے  
 امکانات موجود ہیں۔ جو ماننے والے کھے وہ مان گئے جو نہیں ماننا  
 چاہتے کھے وہ قتل کر دیے گئے فریضہ ادا ہو گیا۔ علیؑ کی حقانیت کو



دُنیا نے تسلیم کر لیا۔ اہلی اور نقلی ظاہر ہو کر رہے۔ ان جنگوں میں علیؑ  
 کی حقانیت اتنی طاقتور شکل میں ظاہر ہوئی کہ لوگوں کو مخالفین  
 علیؑ کے لئے خطار و جہتادی کی تاویل کرنی پڑی۔ لیکن قابلِ لحاظ  
 بات یہ ہے کہ خطار و جہتادی بس انھیں جنگوں تک آتی رہی۔ اور  
 جہاں جہاں تک خطار و جہتادی کی تاویل ہے وہاں وہاں تک  
 حدیثِ رسولؐ یہ بتا رہی ہے کہ کیا حق ہے کیا باطل، دوزخ کدھر  
 ہے جنت کدھر ہے۔ کیا شرم کا مقام پوری ملتِ اسلامیہ کے لئے  
 نہیں کہ رسولؐ یہ فرماتے ہیں کہ عمارؓ کھٹارا مخالف تم کو دوزخ کی  
 دعوت دے گا اور مسلمان اس کے بارے میں خطار و جہتادی کی  
 تاویل کرتا ہے۔ یعنی رسولؐ کا ارشاد کچھ ہے مسلمانوں کا خیال کچھ ہے۔  
 صفین کے مرحلہ تک ابہام تھا اس لئے یہاں تک حدیثِ  
 رسولؐ واضح طور پر علیؑ کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ اور یہیں تک  
 خطار و جہتادی کی تاویل بھی ہے۔ اس لئے یہیں تک حدیثِ رسولؐ  
 یہ بتا رہی ہے کہ اسے خطار و جہتادی کہنا بھی کھٹاری خطا ہے۔ اور  
 رسولؐ کی رائے پر اپنی رائے کو مقدم کرنے کی سعی ناکام ہے۔  
 اس کے بعد کبھی بہت سے واقعات ہوئے۔ صلحِ امامِ حسنؑ ہے اگر بلا  
 کی خوں ریز داستان ہے۔ امیرِ شام نے صفین کے بعد کبھی خیال  
 خود کار ہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ جنابِ حجر بن عدیؓ اور اس کے  
 اصحابؓ کی شہادت انھیں کا کارنامہ ہے۔ زیاد کو اپنا حقیقی بھائی  
 بنا کر اپنی قوت بازو میں افادہ کرنا انھیں سے ممکن بنا۔ صلحِ امامِ حسنؑ



کے بعد صلح کی ہر دفعہ کو پامال کرنے کی ہمت انھیں میں کھتی۔ یزید کو  
 یہ جبر و سبھد بنانے کی جرأت ان کے سوا کون کر سکتا تھا۔ امام حسنؑ  
 کی شہادت پر نعرہ بکیر بلند کرنے کی بات ان کے سوا کون سوجھ سکتا تھا  
 اسلام میں پہلا سر جو نیترہ پر بلند ہوا وہ صحابی رسولؐ عمر بن حنظلہ خرمیؓ  
 کا تھا۔ یہ انھیں کے عہد کے زریں کارنامے ہیں لیکن ان میں سے کسی  
 کے لئے بھی زر خرید مورخین و محدثین کو امیر شام کے لئے اور یزید کے لئے  
 خطا، اجتہادی کی تاویل کرنے کی ہمت نہ بڑی، اس لئے کہ اب حقانیت  
 ہر شک و شبہ سے بالاتر ہو چکی تھی۔ جہاں تک ابہام کے امکانات تھے  
 اور خطا، اجتہادی کی تاویل کی گنجائش تھی وہاں تک حدیث رسولؐ  
 واضح الفاظ میں اعلان حق کر رہی تھی۔

جنگ صفین کے بعد حق کے ساتھ خواہ کتنے ہی کم کیوں نہ رہے  
 ہوں لیکن قلت تعداد کے باوجود حق دباطل کے بارے میں اب کوئی  
 شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ اب جن جن معرکوں میں مسلمانوں نے اصحاب رسولؐ  
 کے بارے میں خطا، اجتہادی کی تاویل کی ہے جب وہاں نگاہِ سالت  
 میں ان اصحاب رسولؐ کا طرز عمل جو حضرت علیؑ کے خلاف تھے باطل اور  
 خلاف حق تھا تو پھر جہاں جہاں خطا، اجتہادی کی تاویل کی گئی کوئی  
 گنجائش نہیں رہ گئی اس کے باطل ہونے میں کسی مسلمان کو کیسے شک  
 و شبہ ہو سکتا ہے، اور اس کے بعد کبھی کوئی سعی ناکام یزید یا امیر شام  
 کی صفائی کی جاوے تو اس کا اسلام اور رسولؐ اسلام سے کوئی  
 تعلق نہ ہو گا۔ آج واقعات کو بلا کے سلسلہ میں اس طرح کی سعی ناکام بار



جاری ہے۔ لیکن مقام غور ہے کہ خود یزید نے اپنی جو صفائی پیش کی ہے اس سے خود حسین مظلومؑ کی حقانیت کا بول بالا ہوتا ہے۔ یزید نے جب یہ کہا کہ ”خدا غارت کرے ابن مرجانہ کو اس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا“ تو گویا اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ حق کا فیصلہ حسینؑ کے حق میں ہو چکا ہے اس ذمہ داری کا اپنے سر نہ لینا اور وہ بھی دین کے معاملات میں بزرگ باطل ہونے کی قطعی دلیل ہے۔ ابن زیاد اس ذلت کا ذمہ دار یزید کو قرار دے رہا تھا یزید ابن زیاد کو۔ حالانکہ دنیا والے اور عقبی والے دونوں ہی کو مجرم سمجھتے ہیں۔

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ احادیث رسولؐ نے مسلمانوں کے اس نظریہ اور عقیدہ کی پوری طرح تردید کر دی ہے کہ جنگ جمل اور جنگ صفین دہروان میں دونوں حق پر تھتے۔ اب اگر مسلمان اس رائے سے ہٹ کر کچھ اور سوچتے ہیں تو ان کی یہ رائے اسلام اور رسول اسلامؐ کی رائے سے ہٹ کر ہوگی جس کا حق اس کو اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا جب تک وہ اپنے کو دائرہ اسلام میں سمجھتا رہے گا۔

## چھٹی حدیث

ارشاد حضرت ختم الانبیاءؐ ”علیؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ساتھ ہے جدھر علیؑ، گر دشمن کرتے ہیں حق ادھر گروہ دشمن کرتا ہے۔“  
اس حدیث میں امیر المومنین علیؑ ابن ابیطالبؑ کی زندگی کے کسی دور کا استثناء نہیں ہے جس میں وہ حق سے جدا ہوئے ہوں اور



حق کے کسی عہد کا استثناء ہے کہ وہ علیؑ سے جدا ہوا ہو۔ حالانکہ سرعالم  
 کے فریق منصفی کا یہ تقاضا تھا کہ اگر کوئی استثناء ہوتا تو وہ اسے  
 ضرور ذکر فرماتے، خود انھیں علیؑ کے بارے میں آپؐ نے حدیث  
 منزلت میں استثناء کیا ہے۔ سرزاد کی جو امان اہل جنت کی حدیث  
 میں حضرت علیؑ کا استثناء ہوا ہے تو کیا یہ ممکن نہ تھا کہ اس حدیث میں  
 بھی کچھ دیر کے لئے سہی لیکن علیؑ کی زندگی کے کسی حصہ کو مستثنیٰ  
 کر دیا جاتا یا حق کو علیؑ کی زندگی کے کسی پہلو سے علیحدہ کر دیا جاتا  
 میرا یہ یقین ہے کہ اگر علیؑ حق کی چھائی کی زندگی کے کسی لمحہ میں ہوتی  
 تو رسول اکرمؐ اس زندگی کو ضرور اس حدیث میں بیان کر دیتے یا  
 پھر یہ حدیث ارشاد ہی نہ فرماتے، اور جب کوئی استثنیٰ نہیں ہے  
 تو پھر عقل سلیم یہ تسلیم کرے گی کہ اس حدیث کی روشنی میں عہد طفلی سے  
 لے کر عہد کو فری میں شہادت تک کی زندگی شامل ہے۔ اور اس  
 پورے دور میں نہ صرف یہ کہ علیؑ حق کے ساتھ رہے بلکہ حق بھی علیؑ کے  
 ساتھ رہا۔ اور نہ صرف یہ کہ حق علیؑ کے ساتھ رہا بلکہ جدھر علیؑ گردش  
 کرتے تھے حق ادھر گردش کرتا تھا یعنی حق تابع علیؑ تھا۔

اب تاریخ پر نگاہ ڈالیں۔ تاریخ یہ کہتی ہے کہ بعثت کے بعد  
 اسلام لائے۔ تو کیا قبل بعثت کی زندگی خلاف حق تھی اگر کھتی تو  
 حدیث غلط دگر نہیں تھی اور یقیناً یہی صحیح بھی ہے تو تاریخ غلط۔  
 اس لئے ماننا پڑے گا کہ اسلام لائے کی لفظ تاریخ نے غلط لکھی ہے  
 بعثت کے بعد اظہار اسلام کیا۔



یعنی "جدھر حق گردش کرتا ہے ادھر علیؑ گردش کرتے ہیں" یہ ہوتا کہ  
ناطق صامت کا پابند ہوتا۔ دوسری صورت میں "جدھر علیؑ گردش  
کرتے ہیں ادھر حق گردش کرتا ہے" صامت ناطق کا پیرو ہو گیا  
اب فضیلت ناطق کو ہے۔ صامت کو نہیں۔ حدیث ثقلین میں  
سول اکرمؐ نے دو چیزیں چھوڑی تھیں۔ ایک صامت ایک ناطق  
اس حدیث کی روشنی میں اب امت یہ فیصلہ کرے کہ کون کسے ہے  
اور کون اس کے بعد۔ قرآن عین حق ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اسلام  
ختم ہوا اور اگر عین حق ہے تو پھر اس حدیث کی روشنی میں قرآن کو  
نیزوں پر بلند نہ دیکھئے بلکہ علیؑ کے ساتھ دیکھئے۔ علیؑ کے گلے میں  
حائل دیکھئے۔ اور اگر نہ دکھائی دے تو صرف علیؑ کو دیکھئے۔

قرآن ہر حال میں انھیں کے ساتھ ہو گا۔ اس لئے کہ حق تابع  
علیؑ ہے۔ علیؑ کو تابع نہیں کہا گیا ہے۔ یہ حدیث علیؑ کے  
بارے میں ہر اس تصور کی نفی کرتی ہے جو علیؑ کو ان کے مرتبے سے  
بڑھائے یا کم کرے۔ یا جو قرآن کو اہلبیتؑ پر فضیلت دے۔  
دونوں کا مرتبہ بلند سے بلند تر ہے ناطق کو فضیلت اس لئے ہوتی  
ہے کہ صامت بذات خود راہ حق کی نشاندہی کرنے کے لئے کافی  
نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اگر صرف صامت ہو گا تو لوگ اس کے بالے  
میں اپنے اپنے مطلب کے مطابق تاویل کریں گے اور دعویٰ یہی  
کریں گے کہ بس حق یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ صامت یہ نہیں کہہ سکتا کہ  
کہنے والے کا بیان غلط ہے اس لئے باطل پرست بھی اپنے کہ



حق پرکھے گا اور حق والا تو حق ہی پر ہوگا لیکن اگر صامت کے ساتھ  
 طاقت بھی ہے تو طاقت کا علم راہ حق کے لئے نشان منزل کا کام دیکھا  
 اور وہ لوگوں کی غلطیوں کی بھی نشان دہی کرتا رہے گا اس طرح غلط  
 افراد خاموش رہنے والے حق کو اپنی منشاء کے مطابق نہ استعمال کر سکیں گے  
 ہی لئے اس حدیث میں سرور عالمؐ نے حق کو تابع علیؑ بتایا، علیؑ اس کو  
 تابع حق نہ ارشاد فرمایا، اس لئے کہ علیؑ اگر تابع حق ہوتے تو علیؑ  
 کے دور میں بھی ادران کے بعد بھی وہ لوگ جو علیؑ سے اختلاف  
 رکھتے تھے وہ بھی اپنے کو حق ہی پر کہتے اور اس عمل کی مختلف  
 تاویل کر دیتے۔ اگر کوئی تاویل اس عہد میں ممکن نہ بھی ہوتی تو  
 ان افراد کے بعد ان کے تابع اور پیروان لوگوں کی صفائی میں  
 نظام جہتادہ کی تاویل کر کے ان کی خلاف حق سیرت کو حق ثابت  
 کرتے کی کوشش کرتے۔ لیکن جب سرور عالمؐ نے حق کو تابع علیؑ  
 فرمایا تو اب ہر وہ تاویل جو علیؑ کے مخالفین کی جانب سے اپنے عمل  
 کی تائید میں کی جائے گی وہ کلام رسالتؐ کی تکذیب کے سوا اور کچھ  
 ہونے کے گی۔ کلام بلاغت نظام پیغمبرؐ کے مطابق حق علیؑ کے ساتھ  
 ہے اور تابع علیؑ بھی ہے اس لئے علیؑ سے علیحدہ رہ کر حق کی تلاش  
 محض لا حاصل کے محدود سے کبھی آگے نہ بڑھے گی۔ اب خواہ علیؑ کا  
 دور ہو اور اس دور کے لوگ ہوں یا علیؑ کے بعد کا دور ہو تلاش  
 میں ہر دور کے لوگوں کے لئے رسول اکرمؐ کے بعد علیؑ کو دیکھنا  
 ہے اور ان کی سیرت پر نظر رکھ کر آگے بڑھنا ہے۔



مسلمانوں کے نقطہ نظر سے صحابہ یقیناً حق پر تھے اس تعداد میں اختلاف ہے کہ کتنے حق پر تھے اور کتنے نہیں لیکن پھر بھی بہت سے صحابی ایسے ہیں جو بلا کسی اختلاف کے حق ہی پر تھے۔ حضرت علیؑ کے ساتھ ساتھ حضرات حسنین علیہم السلام بھی تو حق ہی پر تھے لیکن ارشاد رسالت صحت علیؑ کے لئے ہوا کہ وہ حق کے ساتھ ہیں اور حق ان کے ساتھ۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی آسان ہے کہ رسول اکرمؐ نے صرف حضرت علیؑ کے بارے میں اس حدیث کو ارشاد فرما کر اپنے بعد کے ہونے والے خلا کو پُر کر دیا تھا۔ اس لئے کہ ذات رسالتؐ کے بعد ہی بہت سی شخصیتیں ایسی ہو سکتی تھیں جو علیؑ سے بنام اسلام اختلاف کر سکتی تھیں اور چونکہ ظاہری حیثیت سے ہر ایک رسولؐ کے قریب رہا تھا، اس لئے عوام اور خواص دونوں کے لئے اختلافات کی صورت میں یہ سمجھیں ہو سکتی تھیں کہ حق کس کے ساتھ ہے لیکن اس ارشاد رسالتؐ کے بعد سمجھنے والے ذہن کے لئے حق کا راستہ بالکل صاف ہے اس لئے کہ حق پر بہت سے صحابہ ہو سکتے ہیں لیکن ملت میں علیؑ کے سوا اور کوئی ذات ایسی نہ تھی جس کے پیچھے حق گردش کرتا ہو۔ حق جس کا تابع ہو گا اس سے غلطی کا امکان نہ ہو گا اور رسولؐ کے بعد ایسی ہی شخصیت کی ضرورت تھی جس سے غلطی کا امکان کسی حال میں نہ ہو۔

اگر ملت رسول اکرمؐ کے بعد علیؑ کا انتخاب متفقہ طور پر کر لیتی تو پھر راہ حق کا تعین بلا اختلاف ہو جاتا۔ اور امیر المومنینؑ اپنے بعد کے



نائب کا اعلان بتا ہی دیتے اور اس طرح یہ سلسلہ رشد و ہدایت بلا اختلا  
 قائم رہ کر مسلمانوں کی رہنمائی کرتا رہتا۔ لیکن مسلمانوں کی بد قسمتی سے  
 جو ہونا چاہیے کھادہ نہ ہوا، اور جو نہ ہونا چاہیے کھادہ ہو کر رہا۔  
 بدیہی بات یہ ہے کہ اگر علیؑ کی ذات کے ساتھ اسلام کے مفاد  
 نہیں وابستہ تھے یا بہت کم وابستہ تھے تو پھر رسول اکرمؐ نے اتنے اصرار کے  
 ساتھ علیؑ کے بارے میں کیوں احادیث و روایات فرمائیں۔ اگر بعد رسول  
 اسلام میں ان کا کوئی اہم ترین مقام نہ تھا تو سرور عالمؐ کو خاموش  
 رہنا چاہیے تھا۔ لیکن اپنی تمام تر مصروفیتوں کے باوجود حضور  
 اقدسؐ بار بار علیؑ کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہتے رہے۔ اور ہر فرمان میں  
 علیؑ کا رابطہ اسلام سے یا علم سے یا ہدایت سے یا اپنے بعد کی سربراہی  
 سے ضرور قائم رکھا۔ غدیر خم میں کتنا وقت صرف ہوا۔ حدیث طبرستان  
 میں کتنی مدت صرف ہوئی۔ بیشتر مواقع پر صرف علیؑ سے تعلق کر کے  
 کے لئے کتنا وقت صرف فرمایا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بہت سے مسائل  
 ایسے ہیں جہاں علیؑ و رسالت کے تعلقات مسطور نظر آتے ہیں۔  
 سوچنے کی بات ہے کہ آیا ان تمام باتوں کا کوئی مقصد تھا یا معاذ اللہ  
 یہ صرف تصنع و وقافت کی جارہی تھی۔ مسلمانوں کو اختیار ہے کہ وہ  
 جو چاہیں سمجھیں۔ لیکن رسول اکرمؐ اپنے عمل سے اپنے بعد کے لئے  
 علیؑ کو ایک متفرد حیثیت سے پیش کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ مسلمانوں کو  
 رسولؐ کے بعد کوئی دشواری نہ ہو۔ اگرچہ نتائج نے یہ بتا دیا کہ وہ دشواری  
 مسلمانوں کا نصیب بن چکی تھی۔ لیکن رسول اکرمؐ نے اپنا فریضہ بتلینے



تو ادا کر دیا جت تو تمام کر دی۔ آج مسلمان بڑی سادگی اور بھولے  
 پن سے یہ کہہ جتا ہے کہ سب کے سب صحابی رسول ہوتے سب کے مرتبے  
 بلند ہوتے، ہم جیسے لوگ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کون صحیح تھا کون غلط  
 تھا ہم بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ سب حق پر ہوتے۔ لیکن مانتی کی تار و نخ  
 سے خداوند عالم کی قائم کردہ ایسی نظیر نہیں ملتی جیسا جس سے رائے  
 قائم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ قرآن میں تمام ایک ٹاکہ  
 چوبیس ہزار انبیاء کے واقعات نہیں بیان کئے گئے ہیں۔ صرف طالع  
 خاص واقعات کو کہیں اجمال کہیں تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے  
 ظاہر ہے کہ ان واقعات کے بیان کرنے کا ایک واضح مقصد یہ  
 بھی ہے کہ اس چھٹی کی داستان سے حال و مستقبل کے لوگ سبق  
 لے سکیں اور سچا اصلاح کریں۔ مذہب کی دنیا میں رشتہ دار پولاد  
 نسب کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی صرف کردار پر زور دیا گیا ہے  
 قدرت کے پیش نظر اگر رشتہ دار یاں اور نسب کے تعلقات ہوتے  
 تو قابیل کے کارناموں کو قرآن میں اس طرح نہ پیش کیا گیا ہوتا  
 برادران یوسفؑ کے واقعات اتنی تفصیل سے نہ پیش کئے جاتے  
 ازدواج جناب نوحؑ و لوطؑ کے واقعات کیا پر وہ پستی کی جاتی۔  
 ان واقعات کی درج قرآن نظروں کے بعد کوئی مسلمان یہ نہیں  
 کہہ سکتا کہ ہم کیا اظہار خیال کر سکتے ہیں دونوں اولاد پیغمبر ہیں۔  
 اس لئے ہم خاموش رہیں گے یا خدا جانے ہمارے نزدیک تو  
 انبیاء کے ازدواج ہیں۔ بس ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کیا حق ہے



کیا ناحق ہے اور جب ہم کو حق اور ناحق معلوم ہو جائے تو بس ہمیں شخصیت اور رشتے کو نہیں دیکھنا ہے، حق کی نشاندہی کا ذریعہ کوئی بھی ہو لیکن وہ ذریعہ رسولؐ سے بڑھ کر معتبر نہیں ہو سکتا۔ جب سرور عالمؐ نے حق کی نشاندہی فرما کر دی کہ "علیؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ساتھ رہے جلدھر علیؑ گردش کرتے ہیں اور حق گردش کرتا ہے" تو اب اس ارشاد نبویؐ کے بعد شخصیت اور رشتے و تعلقات کو نہیں دیکھنا ہے صرف علیؑ کو دیکھنا ہے کہ وہ کدھر ہیں۔ پس جلدھر علیؑ ہوں گے حق کی گردش اسی سمت ہوگی۔ یہ کہنا تو بہت آسان ہے کہ سب صحابی حق کے ساتھ کھتے لیکن کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حق بھی سب کے ساتھ کھتا۔ ہر حال میں حق اگر کسی کے ساتھ رہا تو وہ ذات اقدس علیؑ ابن ابی طالبؑ کی کھتا۔ اس لئے منزلِ امتحان جس آئیگی تو اصحاب کے طرز عمل سے زیادہ علیؑ کے طرز عمل پر نگاہ رکھنے میں ہی نجات ہوگی۔ اور جب علیؑ کے ذریعہ حق کا یقین ہو گیا تو پھر خطا، جہتادہی کی تاویل افراد سے محبت کا مظاہرہ تو بن سکتی ہے لیکن حق سے محبت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

## ساتویں حدیث

عید کا موقع ہے۔ مدینہ کے رہنے والے نماز عید کے لئے بیرون شہر جا رہے ہیں۔ سرور عالمؐ بھی تیار ہیں۔ آپ کے دونوں کمسن نواسے بھی نانا کے ہمراہ چلنے پر کمر بستہ ہیں۔ بچے اپنے نانا سے یہ کہتے ہیں کہ



”نانا اصحاب کے بچے اپنے ناقول پر جا رہے ہیں ہمارے لئے بھی نائق کا انتظام کیا جائے“ عالی مرتبت نانا بچوں کی اس خواہش کو اس طرح پورا کرتا ہے کہ اپنے دونوں کندھوں پر دونوں کو بٹھا لیتا ہے۔ بچے نائق کے تصور میں ہمارا نائق کا مطالعہ کرتے ہیں، نانا اپنی زلفوں کو ان کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ بچے نائق جیسی آواز کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ نانا اپنے دہن مبارک سے ناقول جیسی آواز نکالتے ہیں، اکابر صحابہ (مہاجرین و انصار) اس منظر کے نہ صرف یہ کہ تماشا شانی ہیں بلکہ ساقی ساقی عید گاہ کی طرف چل رہے ہیں۔ عالم اسلام کے ایک ممتاز صحابی (عالم با حضرت ابو بکر یا حضرت عمر) نے جب یہ رائے ظاہر کی کہ کتنا اچھا مرکب ہے تو سرور عالم نے ان صحابی کی طرف چپیں جھریں ہو کر دیکھا اور زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری فرمائے کہ ”تم نے یہ بھی کیوں نہ کہا کہ راکب بھی کتنے اچھے ہیں۔“ یہ ہے پورا وہ واقعہ جو میں نے علم دقیقین کے ماتحت مختصر طور پر اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ الفاظ بدل سکتے ہیں لیکن واقعہ اسی قدر ہے۔ جس واقعہ کے سلسلہ میں آنحضرتؐ نے یہ حدیث ارشاد فرمائی وہ زبان ردّ فاعل و عام ہے۔ حکیم الامت شاعر مشرق علامہ اقبال نے اپنی شہرہ آفاق فارسی نظم میں اس واقعہ کو ذیل کے شعر میں یوں پیش کیا ہے۔

ہر آن شہزادہ خیر المثل ویش ختم المرسلین نعم النحل  
آئیے اس حدیث کے مضمرات پر نگاہ ڈالیں اور فرمان رسالت کے



دو روز دوسرا در چہتی الا مکان غور کریں۔

سرور عالم کی پوری عمر مبارک ۶۳ سال ہے۔ ۴۴ سال قبل بعثت۔ ۲۳ سال بعد بعثت۔ اس ۲۳ سال میں ۱۳ سال مکہ کی پر آشوب زندگی اور ۱۰ سال مدینہ میں مکہ کے مقابل میں نسبتاً پرسکون ماحول جس میں شریعت کو قیامت تک باقی رہنا تھا اور جس کے بعد سلسلہ نبوت ہمیشہ کے لئے ختم ہو رہا تھا اس میں دین و شریعت کی تبلیغ کے لئے مشیت ایزدی نے صرف ۲۳ سال کی مدت رکھی، حالانکہ اس کے قبل کے انبیاء کرام کی عمریں خاصی طویل ہوا کرتی تھیں۔ جناب نوحؑ ۹۰۰ برس تک اپنا فریضہ تبلیغ ادا فرماتے رہے۔ حالانکہ اس زمانہ میں ایک نبی کے بعد دوسرا نبی آتا اور تبلیغ کے فرائض کو سنبھال لیتا ہے۔ حالات کی تبدیلی کے ساتھ احکامات بھی برابر بدلتے رہتے ہیں۔ کسی زمانہ میں کوئی شریعت کسی زمانہ میں کوئی شریعت۔ انبیاء کرام کی عمریں کافی طویل لیکن عمر شریعت قلیل۔ لیکن خالق کو سرور کائنات کی تبلیغ پر اتنا بھروسہ اور اعتماد کہ ظاہری عمر نبوت صرف ۲۳ سال اور عمر شریعت کا دامن دامن حیات سے بندھا ہوا۔ وقت بہت کم اور کام بہت زیادہ۔ اب اسی ۲۳ سال میں ہادی عالم کو وہ سب کچھ کر دینا ہے اور کہہ دینا ہے کہ جس کے اجمال میں قیامت تک کے مسائل کی تفصیل مضمر ہو۔ اسی ۲۳ سال میں ابتدائی ۱۳ سال مکہ میں اس طرح گزرے کہ بعثت کے بعد ۳ سال کی خاموش زندگی بھی ہے۔ اسی میں اعلان کے بعد ۳ سال کی شغب ابی طالب کی قید بھی ہے اور سات سال کی پُر از اضطراب زندگی بھی ہے پھر مدینہ کی دس سال کی نسبتاً پرسکون زندگی ہے۔ غرضیکہ



اسی ۲۳ سال میں سب کچھ ہے صلح بھی ہے جنگ بھی رات بھی شامل ہے  
 دن بھی۔ نمازیں بھی شامل ہیں اور دوسری عبادتیں بھی۔ اب ذہن انسانی  
 ارتقاء کی جتنی بھی منزلیں طے کرے اسے اسی ۲۳ برس کے اجمالی میں  
 ارتقاء انسانیت کے سارے تفصیلات مل جائیں گے۔ یہ ۲۳ سال ان  
 مسلمانوں کے لئے خاص طور سے مجید اہم ہیں جو بودا رسولؑ کسی مودوم سلسلہ  
 رشد و ہدایت کے قائل نہیں ہیں۔ اب انہیں حیات رسالتؐ ہی سے  
 سب کچھ حاصل کرنا ہے۔ تو اب یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سرور عالم کا ہر لمحہ بڑا  
 ہی قیمتی تھا۔ عام افتاد و طبع کے مطابق ۲۳ سال میں اللہ زندگی راحت  
 و آرام میں صرف کرنی پڑتی ہے۔ رسول اکرمؐ نہ بھی سوتے رہے ہوں۔ اسلئے  
 کہ اگر سوتے ہوئے تو قرآن مجید یہ کیوں کہتا کہ "ماتواں کو کم حالت قیام  
 میں رہا کیجئے" لیکن وہ مسلمان جو حضورؐ سے کسب فیض کرتا تھا۔ وہ تو  
 آرام کرتا تھا کھاتا کھاتا پیتا تھا۔ کسب معاش کی فکر میں رہتا تھا۔ اس کے  
 ماسوا بقول اسلام کی رفتار بھی رسول اکرمؐ سے کسب فیض میں ایک  
 رکاوٹ تھی کوئی ابتداء میں اسلام لایا کوئی انتہا میں۔ صلاحیت ذہنی  
 کا مسئلہ تو ان سب سے علیحدہ ہے اس پس منظر میں یہ ضروری تھا کہ  
 رسول اکرمؐ کم سے کم وقت میں مسلمانوں کو سب کچھ بتا دینے کی فکر فرماتے  
 لیکن رسولؐ کا عمل بظاہر اس کے برعکس معلوم ہوتا ہے۔ رسول سجدہ  
 میں بیٹھا اور حسینؑ پرشت مبارک پر حسینؑ کے اس عمل کی وجہ سے  
 سرور عالم کی زبان مبارک پر ستر مرتبہ تسبیح کے الفاظ جاری ہوتے  
 آتے۔ اگر حسینؑ پرشت مبارک پر نہ ہوتے تو یہ الفاظ صرف تین چار



ہی مرتبہ ادا کئے جاتے، ایسی صورت میں ۶ بار کا اضافہ ہوا۔ کتنی دیر  
 میں یہ الفاظ زبان مبارک سے جاری ہوئے اس کا اندازہ آج کی  
 دنیا میں لگانا کچھ دشوار نہیں ہے۔ اب بڑا اسلام یہ فیصلہ کرے کہ  
 آیا یہ محبت اولاد میں تبلیغ و ہدایت کے قیمتی اوقات سوا ذمہ بردار  
 کئے جا رہے ہیں یا کسی اہم بات کی تبلیغ فرمائی جا رہی ہے اور عبادت  
 میں مزید عبادت سائل کی جا رہی ہے۔ یہ محبت ذاتی ہے یا سجدہ میں  
 اللہ سے لو لگی ہوئی ہے۔ سجدہ میں جو وقت حیان کی وجہ سے زیادہ صحت ہوا  
 وہ بعد نماز خطبہ و موعظہ میں اگر صرف ہوتا تو بظاہر مسلمانوں کو زیادہ فائدہ  
 ہوتا۔ اور اسی طرح کے بہت سے مواقع ہیں۔ ماننا پڑے گا یہ بھی ایک  
 اندازہ تبلیغ کھانا۔ رسول مستقبل کے رہنماؤں سے مختلف انداز میں عبادت  
 کے مخصوص حالات میں تعارف کر رہے تھے۔ عبادت کے کتنے طریقے ہیں  
 اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تبلیغ کے کتنے انداز ہیں اسے جاننے کی ضرورت  
 ہے۔ اس کا نہ سمجھ کر اور نہ جان کر مسلمان گمراہ ہو گیا۔ اس مہتد کے بعد ایسے  
 اس واقعہ پر نگاہ ڈالنے جس کے سلسلہ میں یہ حدیث مذکور اور مشاہد  
 ہوئی ہے۔ نماز عید کی جگہ تک جانے کے لئے نواسوں نے سواری کا مطالبہ  
 کیا تھا۔ ناقہ کی فرمائش کی تھی۔ دوش کے لئے نہیں درخواست کی تھی۔  
 رسول اکرم نے ناقہ کی موجودگی کے باوجود اپنے دوش مبارک کی خود  
 پیش کش کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذہن رسالت کسی خصوصی اہتمام  
 کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ ناقہ عمومی حیثیت رکھتا ہے ایسی سواری جو  
 سب کے لئے جاذب توجہ ہو۔ اور پوری تاریخ میں اپنی ندرت کو باقی



رکھے۔ اور جس کے دور رس نتائج ہوں۔ ناقہ جتنی دیر میں منزل تک پہنچتا  
 رسول مقبولؐ اپنے دوش پر بچوں کو بٹھا کر اتنی دیر میں نہیں پہنچ سکتے  
 تھے۔ یہ وقت کے ضائع ہونے کی بات ہے۔ لیکن وقت کی قیمت سے  
 ان بچوں کی قدر و قیمت کو مسلمانوں کے ذہن نشین کرانا چاہئے ہیں۔  
 صحابہؓ ساتھ ساتھ میں لیکن کسی نے اخلاقاً کبھی یہ نہ کہا کہ دو میں سے  
 ایک صاحبزادے کو تو ہمیں دے دیجئے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے  
 کہ صحابہؓ خود یہ محسوس فرما رہے تھے کہ یہ عالم اوروہ ہے۔ یہ بشریت کے  
 تقاضے نہیں ہیں، یہ تبلیغ و ہدایت کی خصوصی منزل ہے۔ اس بار کو  
 رسولؐ کے سوا اور کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ ان بچوں کے عالی مرتبت باپ  
 کی اس موقع پر خاموشی یہ صاف بتا رہی ہے کہ یہ صرف فراموشی بنوت  
 ادا ہو رہی ہے کیا کوئی بھی کار رسالت میں دخل نہیں دے سکتا۔ ہمارے  
 والدین و سنی ہاشم کے بھر مٹ یا ہجوم میں رسول اکرمؐ نماز عید کیلئے  
 آگے بڑھ رہے ہیں۔ عید گاہ میں ہزاروں نمازی اس منظر کو دیکھتے ہیں  
 بچے دوش رسولؐ پر بٹھا ہر ناقہ کا تصور کئے ہیں۔ ہمارے ناقہ کی فرمائش اُد  
 ناقہ جیسی آواز کے سننے کی خواہش اور رسولؐ ہر ایک تمنا کو پورا  
 کرتے ہیں۔ اب دُنیا بتلائے کہ یہ نواسے کی محبت ہے یا رہنما کا  
 تعارف، اگر نواسے کی محبت کتنی تو اس کے بعد یا اسی وقت اکابر صحابہؓ نے  
 ناقوں سے اپنے بچوں کو اتار کر کیوں نہ سنت رسولؐ پر عمل کرتے ہوئے  
 اپنے دوش پر بٹھا لیا۔ اس وقت موقع نہ کھتا تو بعد میں اس سنت رسولؐ پر  
 عمل کیا جاتا۔ لیکن ایسا کبھی نہ کرنا یہ بتاتا ہے کہ رسولؐ کا یہ عمل مخصوص



افراد کے لئے اور مخصوص مقصد کے لئے تھا اور وہ مقاصد کسی اور ذات کے ساتھ نہیں وابستہ کئے جاسکتے تھے۔ جب رسولؐ اسی عالم خاص میں آگے بڑھ رہے تھے تو ایک نمایاں صحابی کی زبان سے آواز نکلی کہ ”کتنا اچھا مرکب ہے“ یہ الفاظ خود یہ بتا رہے ہیں کہ کہنے والے صحابی کی تعریف باعتبار سواری نہ تھی بلکہ باعتبار کردار و عظمت پیغمبرؐ تھی۔ کہنے والے نے جو کہا تھا وہ غلط نہ تھا۔ رسول اللہؐ کی جو تعریف اس وقت کے ماقول ہیں ان کے ذہن میں آئی وہ زبان پر آگئی اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ کہنے والا واقعات کے تمام رخ کو بیان بھی کر دے اس مجمع میں سب سے زیادہ اہم ذات رسالتؐ تھی اس کی تعریف کر دی پھر صاحب خلق عظیم پیغمبرؐ کی پیشانی مبارک پر شکن کیوں پیدا ہوئی اؤ کیوں آپؐ نے اعتراض فرمایا رکھے تو صرف یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبرؐ کا اس وقت کا عمل اپنے تعارف کے لئے نہ تھا اپنے قویوں کی معرفت کرانا چاہتے تھے مسلمانوں کے اس مجمع میں مراد رسولؐ یہ تھی انھیں پہچان لو، انھیں سے اسلام کا تھقل وابستہ ہے، صرف رسولؐ کی تعریف سے مقصد پیغمبرؐ نظر انداز ہو رہا تھا اس لئے ہادی عظیمؐ نے اپنے صحابی کو ٹوک کر اپنے مقصد کی وضاحت بھی کر دی ”یہ بھی تو کہو کہ راکب کتنے اچھے ہیں“ رسولؐ کی سیرت واضح طور سے مسلمانوں سے یہ کہہ رہی ہے کہ تم صرف پیغمبرؐ کی تعریف کرتے رہو اور اہلبیت پیغمبرؐ کو نظر انداز کرتے رہو تو یہ بات خوشنودی مزاج پیغمبرؐ کا باعث نہیں بن سکتی۔ خواہ کھٹاری نیت کتنی ہی بہتر کیوں نہ ہو۔ یہ ہے اس واقعہ کا ایک رخ، اب دوسرا



رخ ملاحظہ ہو۔ اگر وہ صحابی یہ نہ فرماتے کہ کتنا اچھا مرکب ہے بلکہ صرف یہ  
 کہتے کہ کتنے اچھے مرکب ہیں تو کیا حضور خفا ہوتے اور آپ کو ٹوک دیتے۔  
 اور یہ نہ فرماتے کہ تم نے مرکب کی تعریف کیوں نہ کی۔ ماننا پڑے گا کہ  
 ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ اس لئے کہ یہ تعریف مقصد رسالت کے مطابق ہوتی  
 ایسی صورت میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہلبیت رسول کی تعریف  
 کیجئے اور رسول کی تعریف نہ کیجئے تب بھی خوشنودی مزاج رسالت بہر حال  
 حاصل رہے گی اس لئے کہ رسول کے اہلبیت کی تعریف یا معرفت بغیر رسول  
 کی معرفت کے ہو ہی نہیں سکتی۔ اہلبیت کی عظمت کا اعتراف گویا خود  
 رسول کی عظمت کا اعتراف ہے۔ قول رسول۔ عمل رسول۔ اور تقریر رسول  
 یہ سب سنت رسول ہیں۔ اس ایک واقعہ میں قول رسول اور عمل رسول  
 دونوں کا مظاہرہ اہلبیت کے لئے ہے۔ اب مسلمانوں کے عقائد و نظریات  
 اہلبیت رسول کے لئے جو کچھ چھٹی ہوں وہ صرف رسول اکرم ہی سے  
 محبت کو کافی سمجھتے ہوں۔ اور اہلبیت رسول کو مسلسل نظر انداز کرتے  
 رہیں اس کے تو وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔ لیکن سیرت رسول مسلمانوں  
 کے عقائد و نظریات کی اساس کر رہی ہے اور گویا مسلمانوں سے یہ کہہ  
 رہی ہے کہ میں نے جسے اپنے دوست پر جگہ دی ہے اسے تم زمین پر نہ گرانے  
 بلکہ اپنے دل میں جگہ دینا۔ کاش مسلمان اس سنت پیغمبر پر عمل کر سکتا۔  
 باسورۃ محمد اسمتہ ایک انگریز مورخ سرور عالم کے کارناموں کا  
 خلاصہ یوں بیان کرتا ہے کہ "محمد دنیا میں وہ اکیلے انسان ہیں جنہوں  
 بیک وقت ایک قوم کی بنیاد ڈالی، ایک مذہب کی بنا کی اور ایک



حکومت کو قائم کیا " قوم سے اسکی مراد متفرق اور پراگندہ عربوں کو متحد کر کے  
 قبیلہ عربی کو ختم کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ بلاشبہ یہ تینوں چیزیں اس  
 آپ کے کردار سے بیک وقت ظاہر ہوئیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں  
 سے مقصود رسالت کیا تھا۔ یہ تو عمل کے نتائج ہیں۔ ماننا پڑے گا  
 کہ مقصود پیغمبران میں سے صرف دین تھا اور دین کے انتظام کے نتیجہ  
 میں باقی چیزیں ضمنی یا ثانوی طور پر یا تھری طور پر خود بخود پیدا ہو گئیں  
 وہ صرف عربوں کے اتحاد کے لئے اس دنیا میں نہ آئے تھے بلکہ پوری  
 دنیا کا اتحاد ان کے پیش نظر تھا۔ اس لئے کہ وہ صرف عربوں کے  
 رسول نہ تھے بلکہ پوری دنیا کے رسول تھے۔ ان کے پاس وقت بہت  
 کم تھا اس لئے ان کے عہد سعادت تک اسلام صرف عرب تک محدود  
 رہا اس لئے صرف عربوں میں اتحاد پیدا ہوا۔ ان کے بعد اگر اسلام  
 کی ترویج انھیں کے خیالات کے مطابق ہوتی تو پوری دنیا نہ صرف  
 یہ کہ مسلمان ہوتی بلکہ متحد بھی ہوتی۔ جہاں جہاں اسلام تشریف  
 روشنی پہنچی وہاں وہاں کے لوگ خود بخود حکومت اسلامی کی بنا ڈالتے  
 جاتے۔ اس طرح ضمنی طور پر حکومت کی بھی بنیاد قائم ہو جاتی۔ لیکن  
 حکومت اور صرف حکومت مقصود رسالت کبھی نہیں تھا۔ اگر حکومت  
 مقصود رسالت ہوتی تو آپ اپنے عہد میں خزانہ دار فوج کی بنیاد ڈالتے  
 عسکری نظام کو مستحکم کرنے کے لئے تنخواہ دار فوج مقرر فرماتے جو اپنے  
 حدود مملکت میں نظام اسلامی کو برقرار رکھتی۔ لیکن ہادی عالم  
 دین میں جبر کے قائل نہ تھے اس لئے نہ فوج رکھی نہ خزانہ کی بنیاد قائم کی



حضرت ابوبکر کے عہد میں بھی کوئی نیا بات نہ ہوئی لیکن حضرت عمر کے عہد میں تنخواہ دار فوج بھی قائم ہو گئی اور بریت المال بھی۔ یعنی جو چیز اسلام کے نتیجہ میں صمنی اور ثنائی طور پر عالم ظہور میں آئی، بھتیں وہ باقاعدہ قائم کر دی گئیں۔ اور بسے مرکزی حیثیت حامل کھتی تھیں دین و شریعت کے تحفظ کے لئے سنت رسولؐ کو باقی رکھنے کی کوشش اسے نظر انداز کر دیا گیا بلکہ اس کے یاد رکھنے والوں پر اور اس کی تبلیغ کرنے والوں پر کوڑے برسائے گئے ان کو گھر سے کھانے والوں میں جناب ابوسریحہ کی شخصیت بھی شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن اگر ہدایت کے لئے کافی ہوتا تو ایک ہی فرقہ کے چار امام چار طرح کی فقہ نہ بیان کرتے اور چار طرح نمازیں پڑھی جاتیں۔ اگلے ہر حال میں تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن کے ساتھ سنت کا تحفظ بعید ضروری تھا۔ لیکن سنت رسولؐ کے تحفظ کے بجائے نظم حکومت اور وسعت سلطنت پر زیادہ زور دیا گیا۔ حکومت تو ختم ہونے والی چیز ہے وہ ختم ہو کر رہی۔ بدیلہ پرستی پھر سے زندہ ہو گئی۔ اموی و سلطنت کو اسلامی نہیں بلکہ عربی دور حکومت کہا جاتا ہے۔ بنی عباس کا عہد عجمیوں کے عروج کا زمانہ ہے غرض کہ رسولؐ کا اسلام ثنائی بن کر رہ گیا تھا۔ عربوں اور عجمیوں کی حکومت کے تذکرے تاریخ میں زیادہ ہیں۔ اسلام کی حقیقی حکومت ختم ہو گئی تھی۔ اسلام کے نام پر حکومت دنیا باقی رہ گئی تھی۔ بعد کے علماء نے کاوشیں کر کے فقہ اسلامی کی ترتیب کی اور فقہ اسلامی کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔



سوال یہ ہے کہ جمہور مسلمین کی جس فقہ کی بنیاد عہد امام ابو حنیفہ میں  
 پڑی وہ پہلی یا دوسری خلافت میں کیوں نہ مرتب کی گئی۔ نظم حکومت  
 زیادہ ضروری تھا یا فقہ و شریعت۔ امام ابو حنیفہ بلا کسی اختلاف کے  
 امام جعفر صادقؑ کے شاگرد ہیں۔ اس میں البتہ اختلاف ہے کہ وہ شاگرد  
 رشید کبھی تھے یا نہیں۔ انھوں نے جب موصوم امامؑ کے ہاتھوں فقہ  
 جعفری کو منظم ہوتے دیکھ لیا تو فقہ حنفی کی بنیاد رکھی۔ امام جعفر صادقؑ کے  
 پہلے کسی موصوم امامؑ کے لئے یہ موقع نہ تھا کہ وہ کسی فقہ کی بنیاد کو  
 قائم کرتا۔ یہی دور ایک ایسا تھا، جس میں بنی امیہ کا زوال اور  
 بنی عباس کے عہد حکومت کی بنا ہو رہی تھی۔ بنی عباس شہادت  
 امام حسینؑ کے تاثرات سے فائدہ اٹھا کر تاریخ کے پردے پر نمایاں  
 ہو رہے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے اس موقع کو دین محمدیؐ کو محفوظ  
 کرنے کے لئے بہترین وقت سمجھا۔ اس کے لئے انھوں نے ارشاد کیا  
 قربانیاں دیں۔ مسلم خراسانی کی حکومت کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ حکومت  
 چھوڑ کر شریعت کا تحفظ کیا۔ آج بنی عباس کی حکومت کے آثار و ختم  
 بکھی ہو چکے ہیں لیکن فقہ جعفری قیامت تک زندہ رہے گی۔ ازکا دل  
 عشق الہی سے معمور تھا اور ۵

ہرگز ہمیر دآنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

اس طرح سے مذکورہ بالا سطور میں نے یہ ثابت کر چکی کہ شمش  
 کی ہے کہ جناب رسول خداؐ نہ تو حکومت کے لئے آئے تھے نہ صرف



عربوں کو متحد کرنے کے لئے وہ جس مقصد کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ اس کی زندگی بھر تبلیغ و اشاعت کرتے رہے۔ جن لوگوں کی ذات سے اس پاک مقصد کا مستقبل وابستہ تھا ان کو سر بلند کر کے پیش کرتے رہے۔ خواہ وہ غم غدیہ کا چیل میدان ہو خواہ آپ نماز عید کیلئے روانہ ہو رہے ہوں ہر جگہ بات صحت ایک ہے۔ وہاں پالان شہر کا منبر بنا کر لوگوں کی توجہ اپنی ادنیٰ کی طرف مبذول کر کے وہ کچھ کہا جس کے کہنے کے لئے یہ انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں عید کے موقع پر اپنے دوش مبارک پر نوایوں کو جگہ دے کر مسلمانوں کی توجہ کو ان کی طرف مبذول کرایا کی شش کی۔ اور اس طرح ہر جگہ تبلیغ نبوت کے فراغ ادا کئے گئے۔ اب مسلمان اسے کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس سے کیا سبق لیتا ہے۔ یہ اس کی اپنی ذاتی ذمہ داری ہے۔

## آنکھوں کی حدیث

ارشاد حضرت رسول اکرمؐ کہ "یہ میرا سینا ہے اسے اچھی طرح پہچان لو" یہ حدیث اس وقت ارشاد فرمائی گئی جب آنحضرتؐ مسجد نبویؐ میں مدینہ میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور حضرت امام حسینؑ عالم طفولیت میں اپنے گھر کے دروازہ سے نکل کر نانا جان کی طرف بڑھ رہے تھے عالم یہ تھا کہ لڑکھڑاتے ہوئے، تیز قدموں سے منبر کی طرف جا رہے تھے اور رسول اکرمؐ نے یہ محسوس فرمایا کہ کہیں میرا فرزند زمین پر نہ گر جائے موعظہ منقطع فرما کر منبر سے تشریف لائے اور



حسینؑ کو گود میں اٹھا لیا اور اسی وقت یہ حدیث اور شاد فرمائی جس کا ترجمہ اوپر درج کیا گیا ہے۔ یہ ارشاد اس مجمع کے سامنے ہوا ہے جو نہ صرت یہ کہ سرور عالمؑ کو بلکہ حسینؑ کو بھی ان کے فرزند کی حیثیت سے اچھی طرح جانتا ہے۔ اس نے بارہا حسینؑ کو آنکوش رسولؐ میں دیکھا ہو گا۔ وہ مجمع جو کہ مسلمانوں کا ہے اس لئے اس مجمع کے لئے نہ صرت یہ کہ بہ اعتبار حقیقت بلکہ بہ اعتبار عرتیدہ کے بھی یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ حسنؑ اور حسینؑ ہی سے نسل رسالت چلے گی ورنہ قرآن کا سورہ کوثر غلط ہو جائے گا۔ یہ مجمع جانے پہچانے لوگوں کا ہے رسولؐ ان لوگوں کو جانتے ہیں اور یہ لوگ رسولؐ اکرمؐ کو لیکن جاننا اور ہے پہچاننا اور ہے اسی لئے حضورؐ صفت جاننے کی بات نہیں کرتے بلکہ پہچاننے کی بات کرتے ہیں کسی چیز کا جاننا بس اس کا رسمی طور پر علم ہونے کے برابر ہے لیکن اس چیز کا پہچاننا اس شے کی پوری معرفت ہونے بغیر ممکن نہیں ہے اور یہی معرفت اصل ہے ہم اس دنیا میں بے شمار چیزوں کو جانتے ہیں لیکن ہمیں معرفت بہت گھڑی چیزوں کی ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کلام الہی ہے لیکن اس کے رموز و اسرار کو سمجھنا بغیر پوری معرفت کے ممکن نہیں ہے اور صرت یہ جان لینا کہ یہ کتاب خدا ہے ہدایت کے لئے کافی نہیں۔ روزانہ کی مثالوں میں اسے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک گھڑی جو ہر وقت ہمارے ساتھ رہتی ہے اور شب و روز ہماری کلائی کی زینت بنی رہتی ہے اور ہر سہا برس تک ہم اس سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں بہت کم لمحات ایسے



آتے ہیں جب وہ ہمارے ہاتھ سے جدا ہوتی ہے لیکن اتنی قربت کے باوجود بھی جب وہ کبھی خراب ہوتی ہے تو ہمیں (اگر ہم گھڑی بنانا نہیں جانتے) اسے گھڑی ساز کے پاس لے جانا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اتنا قریب سے جاننے کے باوجود ہمیں اس کی پوری معرفت نہیں ہے۔ اسی طرح اس سلسلے میں بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بہت زیادہ قریب رہنے کے باوجود بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان کو کسی کی پوری پوری معرفت حاصل ہو جائے۔ یہ حدیث جس وقت ارشاد فرمائی گئی اس وقت عمل رسالت پر نگاہ ڈالنے اور رسول اکرم کی وہ نزاکت عمل پر غور کیجئے تو حسینؑ کے بارے میں سیرت پیغمبرؐ کا ایک غیر معمولی فتح سامنے آتا ہے۔ بعد نماز خطبہ ارشاد فرمانا مسلمانوں کی تبلیغ اور ہدایت کے لئے ایک اہم ترین دینی فریضہ تھا۔ اسی خطبہ اور وعظ کے ذریعہ ان لوگوں کو جو اسلام کو جانتے تھے انھیں اسلام کی بھرپور معرفت کر دینی جا رہی تھی اور اسلام کو پہنچوایا جا رہا تھا اور یہی وہ محل تھا جب حسینؑ کے اور رسولؐ کی نگاہ پوری خطبہ منقطع کیا اور حسینؑ کو گرنے سے بچا کر گود میں اٹھا لیا اور یہ ارشاد فرمایا کہ ”یہ میرا فرزند حسینؑ ہے اسے اچھی طرح پہچان لو“ اس واقعہ سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:-

۱۔ جو مسلمان اس مسجد میں تھے وہ اسلام کو بھی جانتے تھے اور حسینؑ کو بھی جانتے تھے۔ رسولؐ اسلام کو مزید پہنچانے کے لئے



خطبہ اور موعظہ فرما رہے تھے یہاں تک کہ حسینؑ سامنے آ گئے۔ ابان کو پہنچوانے لگے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ خطبہ اور موعظہ سے اہم بات یہ تھی کہ حسینؑ کو زمین پر گرنے سے بچایا جائے اور اس کی معرفت کرائی جائے جو اسلام کا ایک جزو ہے۔

۲۔ خطبہ بہر حال ایک عبادت کی منزل تھی اسے اس وقت تک ترک نہیں کیا جاسکتا تھا جب تک اس سے اہم منزل عبادت نہ آجائے۔

۳۔ اسلام کے تقاروت میں اورینٹ کے تقاروت میں کوئی ایسا ربط باہمی تھا کہ الفاظ اور شخصیت دونوں کو رسولؐ نے یکجا کر دیا۔  
۴۔ پورے کاپور اعلیٰ رسالت جزیات بشریت کے تقاضہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ فریضہ رسالت کی انجام دہی کے لئے تھا۔ درہ خطبہ منقطع کر کے حسینؑ کو گودیں کھلی نہ لیا جاتا اگر حسینؑ صرت فرزند ہوتے۔

سرور عالمؐ یہ جانتے تھے کہ اہلبیتؑ کو محض رسمی طور پر جان لینا مسلمانوں کے لئے کافی نہ ہو گا اسی لئے وہ بار بار عنوان بدل کر لہجہ بدل بدل کر انداز بدل بدل کر اہلبیتؑ کو پہنچوانا چاہتے تھے ایں اچھی طرح معلوم تھا کہ جاننا اسلام کی منزل ہے اور پہچاننا ایمان کی منزل ہے۔ وہ مسلمانوں کو صرف مسلم نہیں دیکھنا چاہتے تھے بلکہ مومن بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ اسلام لانا آسان تھا لیکن اس اسلام کی تصدیق دل سے کر کے ایمان کی منزل میں داخل ہونا دشوار تھا



اسی طرح اہلبیتؑ کو جاننا تو بہت آسان تھا لیکن ان کو پہچاننا  
 اور بعد رسولؐ ان کے نقش قدم پر چلنا آسان نہ تھا۔ اپنی اولاد کے  
 بارے میں پہچنانے کی اتنی کاوش اس کے پہلے کسی اور نبی کے کردار  
 میں نہیں ملتی لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ گذشتہ انبیاءؑ نے اپنی اولاد کو  
 پہچنانے میں اتنا وقت صرف کیا جتنا ہمارے رسولؐ نے کیا۔  
 ظاہر ہے کہ ان انبیاءؑ کے دل محبت اولاد سے خالی نہ تھے لیکن ہر  
 نبی کا عمل اس کے منصب کی بنیاد پر ہوا کرتا ہے اس کے جذبات  
 کی بنیاد پر نہیں ہوا کرتا۔ گذشتہ انبیاءؑ یہ بات جانتے تھے کہ ان کے  
 بعد سلسلہ نبوت باقی رہے گا اور ابھی نما سجدے اپنا فریضہ تبلیغ  
 ادا کرتے رہیں گے لیکن رسولؐ اکرمؐ اپنے بعد کے ہونے والے  
 ہادی اور رہنما کا تعارف اس لئے اور بھی ضروری سمجھتے تھے کہ ان کے بعد  
 سے سلسلہ نبوت ختم ہو رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہلبیتؑ رسولؐ کو آپ پہچنانے  
 کے سلسلے میں ہر اس جگہ نمایاں رکھتے تھے جہاں کوئی دین کی بات ہوتی  
 تھی خواہ وہ حالت نماز میں حسینؑ پشت رسولؐ پر نظر آئیں خواہ  
 موقعہ کی حالت میں آنکھوں میں رسولؐ خواہ نماز عید کیلئے جاتے ہوئے  
 دوش رسولؐ پر نظر آئیں خواہ وہ خانہ کعبہ میں بہت شکنی کی منزل ہو  
 جہاں علیؑ دوش رسولؐ پر ہوں خواہ وہ غدیر خم کا میدان ہو خواہ  
 وہ مباہلہ کی منزل ہو لیکن ہر جگہ کوئی نہ کوئی دینی فریضہ ضرور ادا  
 کیا جاتا رہا ہو گا۔ اس طرح سے مسلمانوں کے عقائد اور نظریات کی  
 اصلاح اس حدیث رسولؐ کی روشنی میں معلوم ہوتی ہے کہ حسنؑ حسینؑ کو



محض رسمی طور پر جان لینا کافی نہیں ہے بلکہ ان کو اچھی طرح پہچاننا بھی ضروری ہے اور بغیر اس معرفت کے نجات کی توقع ایک موبہوم امید سے زیادہ نہیں ہے۔

## نوٹیں حدیث

ہادی عالم سرور انبیاء نے ارشاد فرمایا جس کا لفظی ترجمہ یا مفہوم اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ "میرے دونوں فرزند امام ہیں خواہ وہ کھڑے ہوں۔ یا بیٹھے ہوں۔"

امامت ایک دینی منصب ہے جو خداوند عالم کی جانب سے اپنے خاص بند دل کو ملتا ہے۔ کبھی کبھی یہ منصب نبوت کے درجہ عالیہ پر فائز ہونے کے بعد ایک خصوصی شرف کی حیثیت سے نبی کو ملتا ہے۔ جس طرح جناب ابراہیمؑ کو منجانب خالق عطا کیا گیا تھا۔ اور کبھی بلا منصب نبوت صاحبانِ رشد و ہدایت کو ملتا ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں ارشادِ شہم الہیاء سے ظاہر ہوتا ہے۔

اگرچہ مسلمانوں نے خصوصیاتِ اہلبیتؑ میں عمومیت پیدا کرنے کے لئے تمام دینی القاب کو غلط افراد پر تقسیم کیا ہے۔ ہر فاسق و فاجر بادشاہ کو امیر المومنین کہا گیا ہے۔ ہر ظالم و جابر حاکم کو خداوندِ مطلق اللہ کہا گیا ہے اور صاحبِ اقتدار کو خلیفہ رسول کا لقب دیا گیا۔ اسی طرح امام کے لقب کو نبی بے محل استعمال کرتے ہیں کسی طرح کے تکلف سے کام نہ لیا گیا۔ لیکن قرآن سے بہر حال یہ بات ثابت ہے کہ امامت



ایک ایسا منصب ہے جو کسی ظالم کو کسی حال میں نہ ملے گا جب جناب  
ابراہیمؑ کو امامت کا منصب ملا اور انھوں نے اپنی ذریت کے لیے بھی  
اس منصب کا سوال کیا تو ارشاد خالق یہی تھا کہ کسی ظالم کو میرا منصب  
نہیں ملے گا۔ ارشاد خالق یہ نہ تھا کہ نبی کے سوا کسی دوسرے کو یہ منصب  
نہ ملے گا۔ ظالم کی جو تعریف لغت میں ہے اس سے یہ اندازہ کرنا  
دشوار نہیں ہے کہ ظلم سے سوا معصوم کے کوئی دوسرا شخص بچ ہی نہیں سکتا  
ہے۔ اس لئے امامت منجانب خالق اسی کو مل سکتی ہے جو عملاً معصوم ہو۔  
سرور عالمؐ نے اس حدیث میں جس امامت کا تذکرہ کیا ہے وہ اسی  
طرح کی امامت ہے جہاں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ حدیث کے  
صرت الفاظ ہی کو اگر لیجئے اور اسکی معنویت پر کوئی غور نہ کیا جائے جب  
بھی یہ بات ثابت ہے کہ یہ اپنے صاحبزادوں کی عظمت عمل کی طرف  
اشارہ ہے۔ کھڑے ہونا یا بیٹھنا اگر بے محل ہے تو وہ بھی ظلم کے حدود  
میں آتا ہے اور ظالم امام نہیں ہو سکتا اور رسول اکرمؐ ہر حال میں امام  
کہہ رہے ہیں۔ یہ تو ظاہری معنی ہیں۔ اب آئیے حتیٰ الامکان اس کے  
رموز و اسرار پر غور کرنے کی کوشش کریں۔

۱۔ امامت ایک ایسا عہدہ ہے جس پر خالق خود فائز کرتا ہے۔  
جناب ابراہیمؑ کے لئے یہی ارشاد ہوا تھا کہ ہم نے تم کو انسانوں کا  
امام بنادیا۔

۲۔ امامت کے لیے نبوت ضروری نہیں ہے۔ ورنہ خالق جواب جناب  
ابراہیمؑ میں یہ ارشاد فرماتا کہ میرا منصب امامت غیر نبی کو مل ہی



نہیں سکتا۔

۳۔ امامتِ عالم کو نہیں مل سکتی۔ اور ظلم کے معنی ہیں کہ کسی شے کو بے محل کھنا۔ اور یہ اتنی معمولی غلطی ہے کہ روزانہ کی زندگی میں برابر واقع ہوتی رہتی ہے اس لئے عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ امام خواہ نبی نہ ہو لیکن معصوم ضرور ہو۔ تاکہ سہو و نسیان تک سے محفوظ رہے اور زندگی کے کسی لمحہ میں اس کا ظلم باقی نہ رہے۔

۴۔ سرورِ عالم نے یہ ارشاد فرمایا کہ میرے دونوں فرزند امام ہیں۔ حالانکہ یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ ”حسنؑ اور حسینؑ امام ہیں“ جیسا کہ جو انان اہل جنت کی حدیث میں موجود ہے۔ لیکن اس حدیث میں فرزند کہہ کر نہ صرف یہ کہ ترکان کے سودہ کو شر کی تائید کی گئی ہے بلکہ ان تمام باطل نظریات و تقویدات کی تردید بھی کی گئی جو بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد میں اولادِ رسولؐ کے بارے میں رائج کرہ کی کوشش کی گئی تھی۔

۵۔ حضور ختم الانبیاءؐ اپنے فرزندوں کی امامت کا اعلان کر رہے ہیں جو ایک خالص دینی منصب ہے لیکن جو صفت بیان فرما رہے ہیں وہ روزانہ کی محاسنی زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی کھانا پیٹھنا کھانا پینا چلنا پھرنا۔ یہ سب روزانہ کی زندگی کے تقاضے ہیں ان کا بظاہر امامت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ حضورؐ اپنے فرزندوں کی صرف روزانہ ہی کی زندگی کو نہیں بیان فرما رہے ہیں بلکہ ان نواہل کی عظمت کردار کا تعارف ہے۔ رسول اکرمؐ مسلمانوں کے



ذہن کو مشاہدہ کی راہ سے غیب کی منزل تک لانا چاہتے ہیں۔  
 کھڑے ہونے اور بیٹھنے سے مراد پیغمبرؐ ایک فرزند کی صلح ہے اور دوسرے  
 فرزند کی جنگ ہے۔ مسلمانوں کو زبان رسالت سے یہ بتایا جا رہا ہے  
 کہ اگر ایک صلح کر کے بیٹھ جائے تب بھی اس پر اعتراض نہ کرنا بلکہ امام  
 ہی سمجھنا۔ دوسرا فرزند اگر جنگ کرنے کے لئے میدان میں آکر کھڑا ہوگا  
 جب بھی دونوں کے کھل میں ظاہری فرق کے باوجود اس کو بھی حتیٰ ہی  
 پر سمجھنا۔ دونوں امام ہیں اور ان سے غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے  
 تاریخ اسلام کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ صلح کے مواقع پر بھی  
 ہمیشہ یہ اعتراضات کئے گئے ہیں صلح حدیبیہ سے لے کر صلح امام حسنؑ تک  
 ہی صورت حال نمایاں ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت خواہ جنگ میں  
 ثبات قدم کا مظاہرہ نہ کر سکے لیکن وہ صلح پر ہمیشہ مستحسن رہے۔  
 حدیبیہ ہے کہ حیات پیغمبرؐ میں حکم پیغمبرؐ تک نظر انداز کیا گیا اور جب  
 حیات پیغمبرؐ میں پیغمبرؐ کی بات بے اثر ہو کر رہی تو بعد پیغمبرؐ کا انداز  
 لگانا کچھ دشوار نہیں ہے۔ حدیبیہ سے ہی ملتی جلتی صورت حال امام  
 حسنؑ کی بھی ہے۔ صلح کر لینے کے نتیجے میں وہاں پیغمبرؐ کی رسالت پر شہرہ  
 ظاہر کیا جا رہا تھا۔ یہاں امام زماںؑ کو یا رسول اللہؐ کہہ کر مخاطب  
 کیا جا رہا تھا۔ حالانکہ حدیبیہ اور صلح امام حسنؑ کے شرائطیں بڑا فرق  
 ہے۔ حدیبیہ میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کفار اپنی شرائط پر صلح منوالا  
 رہا اور یہاں معاویہؓ کا غلبہ پیش کر کے امام حسنؑ کے شرائط پر  
 صلح کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود صلح پر ہر جگہ اعتراض ہوتا رہا۔



حالانکہ جو صحیح معنوں میں احتجاج کرتے وہ صلح پر کہیں مسترفض نہ تھے۔ لیکن جو کردار کے غازی نہ تھے وہ ہر جگہ صلح پر اعتراض کر کے گفتار کے غازی بننا چاہتے تھے اور میدان جنگ کے خلا کو صلح کے ماحول میں اپنے نمائندگی، خوش و جذبات کا مظاہرہ کر کے پُر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس حدیث میں رسولؐ اپنے نوادہوں کی صلح کو حق قرار دے رہے ہیں۔ اور ان کی جنگ کو کھلی۔ اب مسلمان اپنے عقائد و نظریات میں اسے جو کبھی سمجھے یہ تو اسے حق حاصل ہی ہے لیکن رسولؐ کیا سمجھ رہے ہیں اسے سمجھ کر کچھ سمجھنا چاہیئے ورنہ رسولؐ اگر مہم کی رائے سے انحراف نہ لگے۔ اور یہ بات اعراض عن الحق و اعتراض علی الحق کے مراد نہ ہوگی جس کے نتائج کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

## دوسری حدیث

ہادی عالم ختم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "جنت میں آدمیوں کی مشتاق مسلمان ہیں۔" مقتدا و ابوذرؓ

ہر مسلمان کی نظری خواہش ہے کہ وہ جنت میں جائے۔ عقیدہ معاد کا تصور جس جس شکل میں جن جن مذاہب میں ہے۔ وہاں جنت جیسی کسی نہ کسی آرام گاہ کا کوئی نہ کوئی تصور ضرور موجود ہے۔ اور مسلمانوں کے لئے تو عقیدہ معاد اصول دین میں شامل ہے۔ ہر اچھا مسلمان نیک اعمال کا صلہ یہاں سے زیادہ آخرت کے لئے اکٹھا



رکھنا چاہتا ہے۔ اور آخرت میں جن عمل کے نتیجہ میں جنت ہی ملے گی۔ جنت کے پر از کمیت و نشاط و تہذیب کے قرآن و حدیث میں برابر ملتے ہیں اور جہاں کہیں بھی قرآن میں جنت کا وعدہ کیا گیا ہے وہاں ایمان کے بعد عمل صالح کی تہذیب ضرور ہے۔ بغیر عمل صالح کے حصول جنت کا تصور ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو گا۔ جنت کے کبھی مختلف مدارج ہیں بہتر اعمال کے نتیجہ میں بہتر مدارج مقدر کئے جائیں گے مسلمانوں کے ہر دور میں اپنی عمد سوائت میں بھی جنت کا تصور بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اور ہر مسلمان کی بہت بڑی خواہش یہی رہتی تھی کہ مرنے کے بعد اسے جنت میں جاگ ملے۔ یہ بات تو قرآن سے ثابت ہے کہ عمل صالح کی عدم موجودگی میں اولاد و پیغمبر و اہلبیت پیغمبر کے زمرہ سے خارج کی گئی اور عمل صالح کی تکمیل کے بعد مسلمان بھی اہلبیت کے زمرہ میں شامل ہو کر مسلمان محمدی کہلائے۔ اس سے یہ بات تو ثابت ہی ہوتی ہے کہ عمل صالح ہر مسلمان کو دنیا میں اہلبیت رسولؐ سے قریب کر سکتا ہے اور آخرت میں جنت سے۔ اسی لئے جو انسان اہل جنت کے سرداروں کو اہلبیت میں سے قرار دیا گیا۔ اس کے سوا اور کوئی دوسری وجہ عقلاً ممکن ہی نہیں۔ جنت اور اہلبیت میں ایک ایسا رابطہ ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

مذکورہ بالا حدیث میں تین صحابہ رسولؐ ایسے ہیں جن کی جنت متنازعہ ہے۔ اب جن کی جنت متنازعہ ہے ان کی عظمت کردار اور بلندی کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس حدیث کے سوا ایک اور حدیث بہت



مشہور ہے جس میں حضورؐ نے دس افراد کو بشارت جنت دی ہے ان  
 دس افراد میں یہ مصلحت یا حالات کے جبر کی بنا پر حضرت علیؑ کا نام بھی  
 احتیاطاً شامل کر دیا گیا ہے تاکہ جعلی اور وضعی نہ معلوم ہو۔ باقی وہ لوگ  
 ہیں جو یا تو خلفاء اسلام ہیں یا خلیفہ گروہ ہے یا جنگ جمل و قادسیہ میں  
 بہت نمایاں رہے لیکن ان دونوں حدیثوں میں زمین و آسمان کا فرق  
 ہے۔ اسلامی تاریخ کی نمایاں شخصیتیں وہ ہیں جن کو بشارت جنت  
 دینے پر اکتفا کی گئی ہے۔ جو کسی بھی مسلمان کو کسی بھی دور میں اپنے  
 حسن عمل کی بنیاد مل سکتی ہے۔ اور دوسری حدیث میں نسبتاً کم نمایاں  
 اور گمنام اصحاب رسولؐ ایسے ہیں جن کی جنت خود مشائخ ہی بشارت  
 جنت والی حدیث میں حضرت علیؑ کو شامل کیا گیا ہے جن کے فرزند  
 جو انان اہل جنت کے سردار ہیں جناب سلمانؓ و مقدادؓ و ابوذرؓ  
 بعد رسولؐ نہ تو آسمان اسلام کے ہر دماہ ہوئے۔ نہ ان دس اصحابہ  
 کے مقابلہ میں ان کو شہرت و عظمت حاصل ہوئی۔ بلکہ جناب ابوذرؓ  
 تو تیسری خلافت میں محبوب قرار دیے گئے اور انھیں ربذہ کی طرف  
 جلاوطن کیا گیا۔ ان کی صاف گوئی ان کے لئے مصیبت بن گئی خلافت  
 کی ترتیب کو مسلمانوں نے ترتیب فضیلت کا پابند بنایا ہے اور اس طرح  
 منصب حکومت کو کردار پر ترجیح دی گئی ہے۔ اس لئے دنیاوی حیثیت  
 سے جناب ابوذرؓ کا کیا وقار ہو سکتا تھا۔ انھیں دنیا والوں نے نظر انداز  
 کیا اور تاریخ نے کبھی بھلا دیا۔ لیکن ہمیں اس سے بحث نہیں کہ دنیا  
 والوں نے ان اصحابؓ کو کیا سمجھا، ہمیں صرف اس سے بحث ہو کہ رسولؐ نے



ان لوگوں کو کیا سمجھا اور ان کی نگاہ مبارک میں ان کا کیا مرتبہ تھا۔  
نگاہ رسولؐ میں ان کی جو عزت کھنی وہ مذکورہ بالا حدیث سے ثابت ہے۔  
اور اب اگر بشارت جنت والی حدیث صحیح مان لی جائے تو بہت سے  
اشکال پیدا ہوتے ہیں جس پر غور کرنا ضروری ہے۔

۱۔ جناب سلمانؓ و مقدادؓ و ابوذرؓ و مسرورؓ عالمؓ کی وفات کے بعد  
حضرت علیؓ کو ایسا رہبر و پیشوا امام سمجھتے رہے۔ دنیا نے اپنی نگاہیں  
جدھر بھی موڑ لیں مگر ان کی نگاہیں ہر حال میں حضرت علیؓ کے اوپر  
کھیں، بلا کسی اختلاف یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں نے رسولؐ  
کے بعد سب سے افضل حضرت علیؓ کو جانا اور سمجھا۔ اور یہ ایک حقیقت بھی  
کھنی۔ تو اب جو رہنما اور امام تھا اس کو صرت جنت کی بشارت اور جو  
لوگ ماموم اور پیرو کھے ان کے لئے یہ ارشاد کہ جنت ان کی مشتاق ہے  
یہ تہیز عقلاً ناممکن ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا بشارت جنت والی حدیث  
کے بارے میں ہر عقیدہ اور نظریہ غلط ہے۔

۲۔ حیات رسالت میں ۳۳ سالہ خدمات کا حاصل کیا صرف دس  
آدمیوں کو بشارت جنت کے سوا اور کچھ نہیں، اس لئے کہ اگر کوئی گیارہواں  
بھی ایسا ہوتا تو رسولؐ اگر مہر اس کو بھی اس فہرست میں شامل فرماتے۔  
پھر اس حدیث کا کیا حشر ہو گا کہ سب صحابی عادل ہیں۔ اس لئے کہ جب  
انفرادی طور پر اعمال ایسے نہیں ہیں کہ جنت میں کوئی نہ جاسکے تو وہ کسی  
دوسرے کی ہدایت کیا کر سکے گا۔ اور یہ بات پوری یقین اسلام کے لئے  
ایک لمحہ فکر یہ ہے کہ اگر حیات رسالت تک کا حاصل بس دس آدمیوں کو



بشارت جنت سے زیادہ نہیں ہے تو جب رسولؐ کی زندگی ذہنوں کو  
 اس سے زیادہ متاثر نہ کر سکی تو بعد رسولؐ دن آدمیوں کے بارے میں  
 یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ وہ جنتی ہوں گے۔  
 اب تک میں نے کچھ اوراق میں جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ ثابت  
 کرنے کی کوشش کی ہے کہ احادیث رسولؐ مسلمانوں کے عقائد اور  
 نظریات کی اصلاح کا ذریعہ ہیں اور ان احادیث سے نہ صرف یہ کہ تاریخی  
 غلطیوں کی اصلاح بھی ہو سکتی ہے بلکہ ہمیں مستقل کی تاریخ کا بھی علم  
 ہو سکتا ہے۔ لیکن اس حدیث سے جس میں جناب سلمانؓ و مقدادؓ و  
 ابوذرؓ کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان کی جنت مشتاق  
 ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صحیح احادیث رسولؐ کے ذریعہ عقل کی  
 رہنمائی میں ہمیں غلط احادیث کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی چیز  
 کے سامنے اگر ان چیزوں کا ملمع بھی رکھ دیا جائے تو یہ اندازہ لگانا  
 دشوار نہیں ہوتا کہ اس میں کون اہلی ہے کون ملمع ہے۔ مذکورہ بالا  
 حدیث بظاہر صرف تین اصحاب رسولؐ کے بارے میں انکی بلندی کردار اور  
 عظمت کی نشاندہی کرتی ہے۔ لیکن جب اس پر نگاہ غائر ڈالی جائے  
 تو یہ حدیث جمہور مسلمین میں راجح اور مشہور بہت سی حدیثوں کے  
 چہرے کی نقاب کشائی بھی کرتی ہے اور اس سے یہ اندازہ لگانا کچھ  
 دشوار نہیں ہے کہ کیا صحیح ہے کیا غلط ہے۔

چنانچہ اس حدیث سے عشرہ مبشرہ دالی حدیث بے حد مجرد  
 ہوتی ہے خواہ وہ جمہور مسلمین کا نقطہ نظر ہو خواہ وہ شیعی نقطہ نظر ہو۔



اس لئے کہ جمہور مسلمین کے نقطہ نظر سے عشرہ مبشرہ دالی حدیث میں جو افراد شامل ہیں ان کی اکثریت کے بارے میں مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ لوگ جناب سلمانؓ و مقدادؓ و ابوذرؓ سے شرف میں بہتر ہیں۔ تو اب جو افضل ہیں انھیں صرف بشارت جنت اور جو غیر افضل ہیں انکی جنت مشاق یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

شیعی نقطہ نظر سے عشرہ مبشرہ دالی حدیث تو غلط ہے ہی لیکن اس حدیث کی روشنی میں اس کی غلطی مزید نمایاں ہوتی ہے اس لئے کہ عشرہ مبشرہ دالی حدیث میں حضرت علیؓ ہیں جو ہر حال میں ان بیٹوں بزرگ صحابیوں سے افضل ہیں۔ حضرت علیؓ کے فرزندوں کے بارے میں یہ ارشاد رسولؐ موجود ہے کہ "حسنؓ و حسینؓ جو اتان اہل جنت کے سردار ہیں اور ان کے باپ ان سے افضل ہیں" تو جب حضرت علیؓ جو اتان اہل جنت کے سرداروں سے بھی افضل ہیں تو انھیں بشارت جنت دینے پر رسولؐ اکتفا کریں اور جناب سلمانؓ و مقدادؓ و ابوذرؓ کے لئے یہ ارشاد فرمائیں کہ "جنت ان کی مشاق ہے" جنت تو علیؓ کے ادنیٰ غلاموں تک کو ملے گی۔ علیؓ کا کیا سوال ہے۔ رسول اکرمؐ علیؓ کے بارے میں اتنی کمزور بات نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح یہ حدیث "اصحابی کلہم عدول" دالی حدیث کی پُر زور تردید کرتی ہے اسی طرح ہمیں صحیح احادیث سے غلط حدیثوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

میں نے اس پورے مقالہ میں روایت اور تاریخ سے بہت کم



کام لیا ہے صرف احادیث اور مشہور ترین واقعات کا سہارا دیا ہے  
 سارا ذوق عقل انسانی پر دیا ہے اور عقل سے نتیجہ نکالنے کی کوشش  
 کی ہے۔ اس لئے کہ اگر عقل نہیں ہے تو دین کا عرفان نہیں ہو سکتا  
 عقل ہی سب کچھ ہے۔ عہد سعادت میں بھی ہمیں ایسے واقعات معلوم  
 ہیں جب آپ خطبہ ارشاد فرماتے تھے اور اصحاب سنتے تھے اور  
 باہر آ کر آپس میں یہ کہتے تھے کہ یہ ابھی کیا فرما رہے تھے۔ بہت سے  
 صحابہ قرآن کے اہم الفاظ و معنی و مطالب کو تاحیات نہ سمجھ سکے۔  
 اس لئے مذہب کا صحیح عرفان بغیر عقل کے ممکن نہیں ہے۔ ایک وہ شخص  
 جو میرے موقف سے اتفاق نہیں رکھنا چاہتا۔ میں اسے مجبور نہیں  
 کر سکتا، لیکن ان لوگوں سے جو عقل کو اہمیت دیتے ہیں ان سے  
 ضرور اپیل کرتا ہوں کہ آئیے واقعات کو عقل کے آئینہ میں دیکھنے  
 کی کوشش کی جائے۔

میں نے جتنی احادیث زیر نظر مقالہ میں پیش کی ہیں وہ صحیح  
 ضرور ہیں خواہ بہت زیادہ مشہور نہ ہوں۔ بہت زیادہ مشہور احادیث پر  
 میں نے اس لئے نہیں متفرہ کیا کہ ان پر اس کے پہلے بہت کچھ لکھا  
 جا چکا ہے۔ ماسوا اس کے میں مناظرہ کو اپنا موضوع بنانے کی  
 صلاحیت اپنے میں نہیں پاتا ہوں۔ نہ میں نے مناظرہ کی غرض سے  
 یہ سطوریں لکھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے لوگ میرے خیالات  
 سے اتفاق نہیں کریں گے۔ میں نے کچھ احادیث کے ذریعہ تاریخی  
 غلطیوں کی اصلاح کی کوشش کی ہے میں اس میں کہاں تک



کامیاب ہوا ہوں۔ اس کے بارے میں خود کیا کہہ سکتا ہوں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار تو کیا ہی نہیں جاسکتا کہ اگر حدیث رسولؐ بالکل صحیح ہے اور تاریخ اس سے ٹکراتی ہے تو حدیث صحیح ہے تاریخ غلط ہے اور کچھ احادیث کے ذریعہ عقائد و نظریات کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ عقائد و نظریات کی اصلاح کا ذریعہ قرآن اور حدیث کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر صحیح حدیث ہے تو اس کے ذریعہ غلط عقائد کی اصلاح نہ کرنا گمراہی کو دعوت دینے کے مراد ہوں گا۔

آخری حدیث میں (دسویں حدیث) میں نے عشرہ مبشرہ والی حدیث کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس جگہ حدیث کے مقابل میں حدیث ہے۔ اب کوئی بھی وہ معتزلی جو میری بات کو نہیں تسلیم کرنا چاہتا وہ یہ کہہ کر میرے استدلال کو رد کر سکتا ہے چونکہ عشرہ مبشرہ والی حدیث صحیح ہے اور یہ حدیث اسکے معارض ہے اس لئے یہ حدیث ہی غلط ہے۔ اس کے میرے پاس دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ کہ علم رجال کے ذریعہ راویوں کی چھان بین کی جائے اور دیکھا جائے کہ حدیث کے راوی زیادہ معتزلی ہیں اور اسے زیادہ قابل اعتبار سمجھا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے یہ صاحبان علم کی منزل ہے۔ دوسرا طریقہ اس کے جواب کا تاریخی اور عقلی ہے جسے میں سطور ذیل میں پیش کر رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس جواب کی سچائی سے انکار ممکن نہیں ہوگا۔



جناب سلمانؓ و مقدادؓ و ابوذرؓ کی شخصیتیں کردار ساز تو ضرور  
ہیں لیکن تاریخ ساز نہیں ہیں۔ یہ گوشہ نشین افراد تھے جن سے  
مورخ کو رہنمائی نہیں ہو سکتی تھی۔ مورخ کی نگاہ تحت حکومت پر  
ہوتی ہے۔ صاحب تحت و تاج افراد کی زندگی کے جزئیات تک  
کو تاریخ محفوظ رکھتا ہے۔ وہاں سے ہٹ کر مورخ کی نگاہ میدان  
کارزار میں آکر رکھتی ہے۔ وہ چلتی ہوئی تلواروں اور چلتے ہوئے  
نیزدوں اور ٹپتے ہوئے لاشوں کو تو ضرور دیکھتا ہے لیکن محراب  
عبادت میں تھکی ہوئی پیشانیوں پر اس کی نگاہ نہیں پڑتی۔ یہ  
تینوں افراد نہ تو تلوار کے بھتی تھے نہ ان کے پاس تحت حکومت  
کھانا نہ خلیفہ تھے نہ خلیفہ گرجھے نہ دربار میں ان کو کوئی رسوخ تھا  
بلکہ جناب ابوذرؓ تو محبوب بارگاہ خلافت رہے۔ ان کی حق گوئی کی  
برداشت حکومت لائی نہیں سکتی تھی۔ خود اہلبیت رسولؐ میں  
وہی افراد تاریخ میں نمایاں جگہ پاسکے جن کے ساتھ حکومت رہی  
یا کوئی میدان کارزار۔ اسی لئے حضرت علیؓ کی زندگی کردار ساز  
بھی ہے اور تاریخ ساز بھی۔ علیؓ امام حسنؓ ایک مورخ امام حسنؓ کے  
ساتھ ساتھ ہے پھر اس کی نگاہ شام کی طرف مڑ جاتی ہے۔ امام  
حسینؓ کے حالات میں بیس سال میں مورخ نے اتنا نہیں لکھا جتنا  
کہ چند دن میں کر بلا میں لکھا گیا۔ تو جب اہلبیت رسولؐ کو نظر انداز  
کیا جاسکتا تھا تو ان کے طرفدار اصحاب رسولؐ کو نہ تو مورخ یاد  
دکھ سکتا تھا نہ محدث۔ یہ تو اس صورت میں جب حالات میں کوئی



پھیر گئی نہ ہوتی اور وہ معمول کے مطابق ہوتے۔ لیکن جب ہم دیکھتے  
 ہیں کہ احادیث رسولؐ کے بارے میں شروع ہی سے اختلاف  
 پیدا ہو گئے، اور عہدِ نبویؐ میں احادیث کے گڑھنے کی  
 باقاعدہ فیکٹریاں قائم کر دی گئیں اور ان تمام احادیث کے  
 بارے میں جو اہلبیتؑ کی شان میں کھنیں کوئی نہ کوئی اتریم  
 کرنے کی کوشش کی گئی یا ان میں جو خصوصیت تھی ان میں عمومی  
 پیدا کی گئی یا اس کے مقابل کوئی حدیث وضع کی گئی یا صحیح احادیث  
 کے قبل و بعد ایسے الحاقی فقرے لگا دیے گئے جس سے حقیقت  
 چھپ جائے یا اس شکل میں باقی نہ رہے جو حدیث کا اصلی منشاء  
 تھا۔ تو جب اہلبیتؑ رسولؐ تک کو اس سلسلہ میں معاون نہ کیا گیا  
 تو دوست دارانِ اہلبیتؑ کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔  
 نبی امیہؑ کا عہد اقتدار تاریخ اسلام کا تاریک ترین دور ہے۔  
 انھوں نے اولادِ رسولؐ اور احادیثِ رسولؐ کو پامال کرنے کی  
 ہر امکانی کوشش سے کام لیا۔ اور قرآن کے ساتھ جو سلوک  
 کئے وہ بھی ظہر من الشمس ہیں۔ اسے نیزوں پر بلند کیا گیا اس پر  
 تیر بار ان کیا گیا۔ اور اس کے معانی و مطالب کی غلط تشریح کی  
 گئی۔ غرضیکہ اسلام کی ہدایت کے جتنے طریقے بعدِ رسولؐ باقی رہ  
 گئے تھے ہر ایک کو متباہ و برباد کرنے کی ہر ممکن سعی سے کام لیا  
 گیا۔ آج امیرِ شام معاویہ کے ابتدائی کاموں کی جب فہرست  
 تیار کی جاتی ہے تو وہ کچھ اس طرح شروع کی جاتی ہے۔



انھیں کے عہد حکومت میں پہلی بار مسلمانوں کو جمعہ کی نماز چہار شنبہ کے دن پڑھنے کا موقع ملا۔

انھیں کے دور حکومت میں نبیذ (جو کی شراب) پہلی بار حلال کی گئی اسلام میں پہلا مسرجو نیزہ پر چڑھایا گیا وہ عمر بن محمّد خزاعی صحابی رسولؐ کا تھا اور یہ عہد امیر شام کا واقعہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ دوست کسی کے بھی نہ تھے۔ انھوں نے اپنے محسن یعنی حضرت ابو بکر و عمرؓ تک کو نہ معاف کیا۔ جب جناب محمدؐ بن ابو بکرؓ نے انھیں وہ خط لکھا جس میں انھوں نے ان کو امیر المومنین حضرت علیؓ کی اطاعت کا مشورہ دیا تھا تو اس کا جو جواب انھوں نے دیا ہے۔ اس جواب میں انھوں نے جس طرح حضرت ابو بکر و حضرت عمرؓ کو رسوا کرنے کی کوشش کی ہے وہ انھیں کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ یہ جواب اگرچہ ایک حقیقت کا اظہار تھا۔ لیکن وہ اپنے محسن کو رسوا کرنے کے بجائے کوئی اہل جواب بھی تو دے سکتے تھے جیسا کہ وہ اس کے پہلے و بعد اکر دیا کرتے تھے۔ شہادت جناب عمارؓ کی جو توضیح انھوں نے بیان کی تھی اس سے زیادہ اہل جواب اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسی طرح کا وہ کوئی جواب محمد بن ابی بکرؓ کو بھی دے سکتے تھے یا خاموش رہتے۔ لیکن اب وہ اقتدار کے مالک ہوتے جا رہے تھے اب انھیں کسی کی پردا نہ تھی۔ ماضی کو وہ کہاں تک یاد رکھ سکتے تھے۔ بھر اس کے بعد یزید کی لعینیت کے سلسلہ میں انھوں نے خلفاء ثلاثہ کی اولادوں کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز کیا بلکہ ان کے ساتھ جو ناروا سلوک کئے وہ تاریخ کے طالب علموں



آج بھی مخفی نہیں ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ کے ساتھ انھوں نے جو کچھ کیا اس پر پردہ ڈالنے کی کوششوں کے باوجود آج بھی چھپایا نہ جاسکا۔ تو ایسی صورت میں علیؑ اور اولاد علیؑ اور اصحاب علیؑ کو وہ کیا معاف کرتے۔ ان کا تحمل بھی ان ذوات مقدسہ کے بارے میں ختم ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی صلاحیت برداشت بھی کھودیتے تھے۔ چونکہ خلفاء ثلاثہ کی اولادوں میں کوئی اتنا صاحب صلاحیت نمایاں نہ ہوا کہ حتیٰ کی راہ میں وہ اپنے کو قربان کر دینے پر آمادہ ہو جاتا۔ اسلئے امیر شام اور خلفاء شام نے ان سے تعزین نہ کیا۔ اگر ان میں بھی کوئی نمایاں ہوتا تو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی معاف نہ کیا جاتا۔ محمد بن ابی بکر رحمہ کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ بہمیت کا بدترین مظاہرہ بھی ہے اور خلفاء کی اولاد سے بنی امیہ کے طرز عمل کا واضح ثبوت بھی ہے۔

اولاد خلفاء ثلاثہ میں ان کے علاوہ ہمیں کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا جس نے حکومت شام کے خلاف آواز اٹھائی ہو۔ اسکے بعد بھی امیر شام نے خفیہ حربوں سے کام لے کر خلفاء ثلاثہ کی اولادوں کو ختم کیا تاکہ یزید کے لئے راہ ہموار ہونے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ تو اب جو راہ حتیٰ میں ان کے بدمقابل تھے ان کو وہ کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔ پوری بنی امیہ کی تاریخ پڑھ ڈالئے۔ عمر بن عبدالعزیز کے پہلے جمع احادیث کی کوئی کوشش نہیں ملتی ہے۔ پھر سناٹا ہے۔ وسعت سلطنت کی ہر امر کافی کوشش کی گئی نظم حکومت کو مستحکم کیا گیا۔ لیکن فقہ و سنت کے لئے کچھ نہ کیا گیا۔ برائے نام ایک فرقہ کا نام



اہلسنت والجماعت رکھ دیا گیا لیکن اس فرقہ کے لئے کوئی کام نہیں کیا گیا  
اس مختصر کوشش کے بعد جب فقہ جعفری کی ترتیب ہو چکی اور امام جعفر  
صادقؑ نے بنی عباس اور بنی امیہ کے اختلافات کے ماحول میں ذرا  
ساموئیل یا کرفقہ محمدیؑ کی بنیاد رکھ دی تو انھیں کے شاگرد امام  
ابوحنیفہ کوفقہ اہلسنت کے جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اب چونکہ  
فقہ جعفری کے مسائل میں ایک دوسری فقہ کی بنیاد رکھی جا رہی تھی اس  
لئے اپنی انفرادیت کی بقا کے لئے قرآن کی واضح ہدایتوں کو نظر انداز  
کیا گیا۔ مثلاً قرآن نے وعدہ اور تم کے بارے میں واضح الفاظ میں  
طریقہ بتائے ہیں اور فقہ جعفری میں اسی کے مطابق ہے لیکن فقہ  
حنفی اس سے بالکل مختلف ہے۔ بہت دور کی ضمیر کو پسروں کے  
دھونے کے لئے صحیح سمجھنا اور تریب کی ضمیر کو نظر انداز کرنا دور کی  
کوٹری لانے کی بات تو ہو سکتی ہے لیکن اس کا عقل سلیم سے کوئی  
تعلق نہیں جبکہ تیمم کا طریقہ تریب کی ضمیر کو صحیح بتا رہا ہے۔ اسی  
طرح اور بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن چونکہ بنی امیہ اور  
بنی عباس کا کوئی مذہب نہ تھا وہ صرف اپنے اقتدار کے بھوکے تھے  
اور وہ دین کے محافطوں کے دشمن تھے اس لئے بس حکومت کی بقا  
کے لئے ایک برائے نام اسلام کی ضرورت تھی۔ بنی عباس جو اہتمام  
خون امام حسینؑ کا نام لے کر اقتدار کی منزل تک پہنچے انہوں نے  
بنی قاطلہ کے لئے اپنے جذبہ عناد کو بنی امیہ سے زیادہ ظاہر کیا اور  
انہوں نے اپنے مظالم سے بنی امیہ کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔



ان کے محلات کی دیواروں میں اسٹحکام اولاد رسولؐ کے استخوانوں سے ہوتا تھا اور ان دیواروں پر رنگینی و گلکاری سی فاطمہؑ کے خون سے کی جاتی تھی۔ محبان اہلبیتؑ کی زندگیاں قید خانوں میں یا دارو رس کے سپرد ہو جایا کرتی تھیں۔ بہلول مجنوں نہ کھتے لیکن جن باتوں کو وہ کہنا چاہتے تھے انھیں دانائے کر نہیں کہہ سکتے تھے انھوں نے مجنوں بن کر حق کی تبلیغ کے فریضے ادا کئے۔ ماموں رشید کا اپنے عہد کے علماء سے حضرت علیؑ کی انصافیت کے بارے میں مناظرہ اور اس کے بعد اعلان اس کی ذہانت کی دلیل ہے لیکن اس کی سیاست کا کبھی اندازہ ہوتا ہے۔ ایک طرف تو وہ علیؑ کے برسر حق ہونے کا اعلان بھی کرتا ہے۔ پھر فرزند رسولؐ امام رضاؑ کو ولی عہد و امام بھی بناتا ہے دوسری طرف وہ امامؑ کو زہر بھی دیتا ہے۔ کتنی دور سے وہ اپنی سیاست کو بروئے کار لاتا ہے۔ وہ بخیاں خود دنیا کو یہ بتاتا چاہتا ہے کہ مجھے جس سے اتنی عقیدت ہے میں اسے زہر تھوڑے ہی دے سکتا ہوں لیکن دنیا میں محاسن چھپ جاتے ہیں معائب نہیں چھپتے اور کبھی نہ کبھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح بنی امیہ و بنی عباس کے اقتدار کو تقریباً چھ سو سال گذر گئے۔ اتنے مخالف ماحول میں اہلبیت رسولؐ اور دستداران اہلبیت رسولؑ کے محاسن اور فضائل کا باقی رہنا حیرت انگیز بات نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ پورا پس منظر تھا جسے میں نے سطور بالا میں درج کیا ہے۔ اس میں احادیث وضع کی گئیں دین و شریعت میں



ترمیم کی گئی۔ اہلبیت رسول کا جو طریقہ دین کے بارے میں تھا اس  
 مختلف طریقے اختیار کئے گئے۔ اُردو نماز میں بسم اللہ اور سے  
 پڑھتے تھے تو ان کے مخالفین نے اسے ہستہ پڑھنا شروع کیا وغیرہ وغیرہ  
 حکومت کی پشت پناہی میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ ایسے ماحول میں  
 ہمیں اگر اہلبیت رسول کے شان میں کوئی بھی حدیث نہ ملتی تو  
 تعجب نہ ہوتا۔ لیکن احسان فراموشی ہو گئی اگر ان علماء و اہلسنت کا  
 بھی شکریہ نہ ادا کیا جائے جنہوں نے فضائل اہلبیت کی بقا کے  
 لئے اپنی جان تک کی بازی لگا دی۔ امام زانی کو شام دالوں نے  
 صرخت حقائق انسانی کی تصنیف پر اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ اسی طرح  
 اور بہت سے علماء تقریباً ہر صدی میں ایسے گزرے ہیں جنہوں نے  
 فضائل اہلبیت کے احیاء کے لئے اپنی کاوش و قلم سے کام لیا۔ چنانچہ  
 بارہویں صدی ہجری میں فرنگی محل کے ایک رفیع عالم علامہ محمد حسین  
 فرنگی محلی نے اپنی مشہور کتاب لکھی جو اثناعشر کے حالات میں ہے اور  
 جس کا نام انھوں نے وسیلۃ النجاة رکھا۔ گیارہویں صدی ہجری میں  
 دوسرے عالم علامہ عبدالقادر عجل شافعی نے اپنی مشہور کتاب  
 آل رسول کے بارے میں لکھی جس کا نام انھوں نے ذخیرۃ المال  
 رکھا۔ دسویں صدی ہجری میں علامہ شمس الدین دولت آبادی نے  
 اہلبیت کے فضائل میں ایک کتاب لکھی جس کا نام انھوں نے  
 مفتاح النجاة رکھا۔ غالباً نویں صدی ہجری میں علامہ کمال الدین  
 محمد بن طلحہ شافعی نے ایک کتاب آل رسول کے مناقب میں



تحریر کی جس کا نام مطالب الرسول فی مناقب آل رسول رکھنا  
 اسی طرح اور بھی لوگ ہوں گے جن کا نام مجھے نہیں معلوم لیکن تذکرہ  
 بالا کتابوں کے مصنفین کے جذبات اور منظور کا اندازہ ان کتابوں  
 کے ناموں ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔ وسیلۃ النجاة۔ ذخیرۃ الملل جیسے  
 نام رکھنا یہ بتاتا ہے کہ حکومتیں بعد رسول ع جن ذوات کو مٹانے  
 کے لئے اپنی ساری کوششیں صرف کر رہی تھیں۔ انہیں ذوات کے  
 بارے میں اسی فرقہ کے علماء اسلام کیا عقیدہ اور نظریہ رکھتے تھے۔  
 اس طرح انتہائی مخالفت ماحول کے باوجود فضائل اہلبیتؑ کچھ  
 بانی تارہ گئے اس لئے اب اگر کوئی حدیث دوست داران اہلبیتؑ اور  
 خود اہلبیتؑ رسولؐ کی شان میں اور دوسری حدیث صاحبان  
 تحت و تاج کے بارے میں ہو اور دونوں ایک دوسرے سے  
 معارض ہوں تو پہلی حدیث کو صحیح سمجھنا صحیح ہو گا اس لئے کہ سلمانؓ  
 مقدادؓ و ابوذرؓ کی شان میں حدیث نہیں وضع کی گئی بلکہ ان لوگوں  
 کے لئے وضع کی گئی جو صاحبان اقتدار تھے۔ ان کے عہد میں نہ ہی لیکن  
 ان کے بعد دشمنان اہلبیتؑ نے جو برسر اقتدار آچکے تھے مراتب  
 اہلبیتؑ کو کم کرنے کے لئے ان میں مساوات و کمزوریت پیدا کرنے  
 کے لئے کچھ ایسی شخصیتوں کا انتخاب کر لیا جن کو عہد رسالتؐ میں اہلبیت  
 رسولؐ کے مد مقابل خیال خود لایا جاسکتا تھا اس طرح ان کی  
 شان میں احادیث وضع کی گئیں۔ وہ لوگ جن کی زندگیاں قید  
 خانوں کے لئے وقف تھیں اور جن کے گلے سن و دار کے لئے تھے



اور جن کے ہاتھ ہتھکڑیوں کے لئے اور پیر بیڑیوں کے لئے کھتے انکی  
 شان میں یا ان کے چاہنے والوں کی شان میں کیا کوئی حدیث  
 وضع کرے گا۔ اور کیوں کوئی ان کی غلط مدح کرے گا۔  
 یہ کہنا کہ شیعوں نے تقیہ کر کے سنی بن کر کتاب میں لکھ دیا اور  
 وہ کتاب میں حنفی مورخین کی کتابوں کی حیثیت سے رائج ہو گئیں،  
 خود فریبی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ صاحبان اقتدار کے عہد میں شیعوں  
 غیر شیعہ بنتا ہے کتابیں لکھتا اس عہد کے علماء اور اکابر اس کی  
 کتاب کی تعریفیں کرتے ہیں اسے امام اہلسنت قرار دیتے ہیں۔ اور  
 اس طرح صدیاں گزر جاتی ہیں جن لوگوں نے اس شخص کو خود دیکھا  
 کھایا جو لوگ اس کے عہد کے قریب کھتے لکھتے ہیں اس پر کوئی شبہ نہ  
 کھتا۔ اب اس دور کے لوگ اسے شیعوں کہنے لگے محض اس لئے کہ اس نے  
 اپنی کتاب میں کچھ ایسے حقائق کو درج کر دیا کھتا جو اس کے  
 عقیدہ سے میل نہیں کھاتے کھتے لیکن یہ حقائق تو اس زمانہ کے  
 لوگوں کی نگاہ سے چھپی گذرے ہوں گے اور اس کے بعد لوگوں نے  
 بھی اسے دیکھا ہو گا تو اس وقت کے عہد کے لوگوں کو اس کے  
 عقیدہ اور مذہب پر کیوں نہ شبہ ہو۔ اگر اس وقت ہوتا اور  
 اگر بات صحیح ہوتی تو یقیناً ہونا چاہیے کھتا تو یہ معلوم کرنا بھی بہت  
 آسان ہوتا کہ یہ شخص حنفی ہے یا غیر حنفی ہے۔ اس کا خاندان  
 معلوم ہو سکتا کھتا اس کی پہلی زندگی معلوم ہو سکتی کھتی۔ اس کے  
 ماحول اور عقیدہ کے بارے میں ہر بات عیاں ہو سکتی کھتی



اس لئے کہ حکومت طاقت دولت ہر شے سے کام لے کر حقائق کا  
پتہ لگایا جاسکتا تھا۔ وہ باتیں تو ان لوگوں کے عقیدہ اور مذہب  
کے بھی خلاف تھیں جنہوں نے ان علماء کو کبھی اپنے مذہب کا امام  
اور گراں قدر علما مانا تھا۔ جبکہ خود شیعوں نے اس مصنف کو کوئی  
بھی اہمیت نہ دی اور اپنی مذہبی زندگی میں ان کے لئے کوئی مقام  
نہ سمجھا۔ مگر اس مصنف کے بارے میں اس وقت اور مدتوں تک کچھ  
نہ کہا جانا بلکہ اس کی عزت کرنا اور اب اسے شیعہ کہنا یہ عصبیت یا  
جہل کے سوا کچھ نہیں۔ اس وقت تک اہلبیتؑ کے فضائل جزو  
دین تھے۔ اب حنفیت کی جگہ عصبیت لے رہی ہے اور حنفی مذہب  
دم توڑ رہا ہے اس لئے حنفی علماء اسلام کو شیعہ کہا جانے لگا ہے  
جس طرح محبت اہلبیتؑ کو رفض کہا گیا جس پر امام شافعی نے جہل کر  
یہ کہا تھا کہ اگر محبت اہلبیتؑ رفض ہے تو دونوں عالم گواہ رہیں  
کہ میں سب سے بڑا راہِ فضی ہوں۔ اسی طرح اب ان علماء اہلسنت کو  
بھی جنہوں نے اپنی کتابوں میں اہلبیتؑ کے فضائل کو جگہ دی  
ہے انہیں شیعہ کہا جانے لگا۔ حالانکہ میں اپنی کم علمی کے باوجود  
یہ بات پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہزاروں سنی  
مذہب کی کتابوں میں سے چھانٹ کر اگر چند ہی ایک کتابیں  
خالی علماء اہلسنت کی تسلیم کی جائیں بلکہ صرف صحاح ستہ ہی کہ  
سنی علماء کی کتاب سمجھا جائے جب بھی ان چند کتابوں میں سے  
فضائل اہلبیتؑ اور حقائق اتنے مل سکتے ہیں جو کسی سمجھنے والے



ضمیر کی رہنمائی کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ صحیح بخاری جسے امام بخاری نے چھ لاکھ حدیثوں سے چھان بین کر کے ترتیب دیا اور جس میں حضرت سات ہزار دو سو پچاس حدیثیں ہیں اور جس میں فضائل اہلبیتؑ کا اخفاء اتنا واضح ہے کہ علماء اہلسنت تک نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ حدیث ہے کہ علامہ بخاری نے حدیث کی کتاب ہونے کے باوجود حضرت ابوبکرؓ کی شہادت اور حجرت اور صحیح حجرت کی تمام سیرت کے جزئیات تک بیان کیا لیکن حضرت علیؓ کا شہادت حجرت نبیؐ پر سونا وہ نہیں لکھ سکے۔ صرف اسی کتاب کو اگر اہلسنت کی کتاب سمجھا جائے جب کھلی اتنے اخفاء کے باوجود اسی ایک کتاب کے ذریعہ بہت سے ان حقائق کا پتہ لگایا جاسکتا ہے جس سے شیعہ نقطہ کی تقدیر ہو سکے۔ جیسا کہ میں نے پہلی حدیث جناب سیدہؓ کے بارے میں اسی کتاب سے لی ہے لیکن ان تمام حقائق کے باوجود جو لوگ میرے موقف کو نہیں تسلیم کرنا چاہتے وہ ہرگز نہیں تسلیم کریں گے اسی لئے میں نے شروع ہی میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر سرور عالمؐ کی وفات کے بعد احادیث رسولؐ کی ترتیب عہد خلافت راشدہ میں کر لی گئی ہوتی تو آج سنت رسولؐ کے بارے میں یہ اختلافات نہ ہوتے لیکن ذمہ داروں نے سنت رسولؐ سے اپنے عہد میں کام تو لیا لیکن اس کی ترتیب دینے کی۔ عمر بن عبد العزیز کے عہد میں تھوڑی سی کوشش احادیث رسولؐ کی ترتیب کی گئی



لیکن صرف چار سال کے قلیل عرصہ میں بہت تھوڑا سا کام ہو سکا  
 اور پھر اس کے بعد مکمل خاموشی یہاں تک کہ پہلی صدی اور  
 دوسری صدی ہجری گزر گئی۔ اس پورے عہد میں سنت رسول کو  
 برباد کرنے کی کوشش تو ضرور ہوئی لیکن اس کو بچانے کی کوئی  
 سعی نہیں کی گئی۔ یہ ہے خلافت و حکومت کا وہ کارنامہ جس پر  
 اسلام ہمیشہ گریاں رہے گا۔ اب صرف یہی جارہ ہے کہ ان احادیث  
 میں سے صحیح احادیث کا انتخاب کر کے اسے عقل سلیم کی روشنی  
 میں دیکھا جائے اور اسی سے راہ ہدایت کا یقین کیا جائے۔  
 یہی کوشش میں نے فی الحال ان دنوں مذکورہ بالا حدیثوں  
 کے ذریعہ کی ہے اور فی الحال انیس عشرہ مبارکہ پر اکتفا کر کے  
 آپ لوگوں کی تحفیف رحمت کرتا ہوں فقط و سلام علی من تبع الہدیٰ

ناچلیو

علی حمید زیدی

ڈاک خانہ مقام سکندر پور

ضلع فیض آباد یوپی

۴ جون ۱۹۷۷ء

مطالب

۲۸، ذی الحجہ الاول ۱۳۹۷ھ